ریت
پر
گرفت

رشید امجد

پہلی چھاپ ——— جنوری ۱۹۷۸ء

تعداد ——— ایک ہزار

مصنف ——— رشید امجد

ناشر ——— امانت ندیم کشمیری بازار راولپنڈی

طابع ——— فرخ پرنٹنگ ورکس گوالمنڈی۔ راولپنڈی

کتابت ——— قاضی محمد منیر

سرورق ——— حمید ساغر

قیمت ——— پندرہ روپے

رُخسانہ کے لئے

۱۹۷۴ء —— ۱۹۷۷ء

نارسائی کی مٹھیوں میں

گھنے سیاہ درختوں کی ریشمی ملائم چھاؤں میں
تپسیا کے کھردرے ، نکیلے پتھروں پر
اس کو جاننے ، پانے کی جستجو میں
ہم اپنی سوکھی انتڑیوں کو
اپنی ننگی ہڈیوں پہ پیٹتے ہیں
سبز مخملی پتوں کے کومل چہروں کو تھپتھپاتی ٹھنڈی ہوا
پتھروں کے ننگے سینوں پہ جھاگ کے پیالے بناتا ، بے لگام دریا
ستونوں ، دیواروں اور چہروں پر
اپنے نام کے نقش بناتا مٹاتا زمانہ
تینوں مل کر عصروں ، خیالوں اور نسلوں کو
کھنڈروں کے بے رنگ تابوتوں میں دفن کر رہے ہیں
کہ ہوا ، دریا اور زمانہ تینوں گورکن ہیں

اور ہم جو سانسوں کے پتواروں سے
اس بے کنار، بے گنت سمندر میں
اپنے وجود کی کشتیاں کھے رہے ہیں
مدتوں سے
ہے اور نہیں کی بھول بھلیوں میں الجھے ہوئے ہیں
اپنے ہونے کے احساس کا کڑوا پھل کھا رہے ہیں
ہم
جو گھنے سیاہ درختوں کی ریشمی ملائم چھاؤں میں
سبز مخملی گھاس پر
خود کو جاننے، پانے کی آرزو میں
اپنی سوکھی انتڑیوں کو
اپنی ننگی ہڈیوں پر لپیٹتے ہیں
ہم بھی کیا ہیں

اس کی یادداشت کی چڑیا صدیوں کے گنجلک چہرے پر پھیلی ہوئی پہچان کو بہت دیر سے دانہ دانہ چگ رہی تھی. لیکن جب بہت دیر کے بعد بھی بنجر شباہتوں کی گود بے یاد کے ہمکتے بچے نے سر نہ اٹھایا تو اس کے دل میں سرسراتی خوشی مرجھاہٹ کی کھردری مٹھیوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئی اس نے اپنا سر میز کی نکر پر ٹکا دیا اور اس کی آنکھوں کی ویران راہداریوں میں بہتی بے بسی رس رس رس کر میز کی شفاف سطح پر بہنے لگی۔

مرشد نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے، میٹھی ملائم آواز میں پوچھا:

—— "تو تم اپنے نام کی آوازیں سنتے ہو؟"

"ہاں" اس نے آنسوؤں میں بھیگا ہوا سر اٹھایا "ہر رات جب میں سونے لگتا ہوں تو پل کے نیچے سے کوئی مجھے آوازیں دیتا ہے اور اپنی طرف بلاتا ہے۔"

مرشد نے کچھ دیر تدبر کیا، پھر دانتوں میں خلال کرتے ہوئے پوچھا —— "تو تم نہیں جانتے کہ آوازیں دینے والا کون ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا،

اور اداسی نے اس کے دل میں دھیرے سے چٹکی لی،

"میں اسے جاننا چاہتا ہوں لیکن میرے پاؤں میں خوف کے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں"۔

مرشد نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا —— "خوف دل کے شفاف آئینہ پر گندی کائی ہے، اسے کھرچ ڈالو"

اس نے اپنی شیونگ کٹ میں سے نیا بلیڈ نکالا اور گلے میں ہاتھ ڈال کر دل پر جمی ہوئی کائی کو کھرچنے لگا۔

لیکن بلیڈ کی تیز دھار کائی کی بجائے دل کے کسی اور حصہ میں اتر گئی۔ درد خون کی بانہوں میں اچھلتا ہوا، اس کی آنکھوں کے فرش پہ ناچنے لگا۔

آرکسٹرا کے انچارج نے اٹھی ہوئی چھڑی کو ایک ادا کے ساتھ نیچے کیا۔ ڈرم پر ضرب لگی اور تیز چیختی لے ہال کی دیواروں سے نیچے اترنے لگی۔ روشنی کے دائرے نے لپک کر سٹیج پر آئی لڑکی کو اپنی گرفت میں لے لیا

لڑکی نے ایک ادا کے ساتھ دائرے میں چکر لگایا

اور اس کی زپ کا ہک چپکے سے کھل گیا۔

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے اندر پھڑپھڑاتی خواہشوں کو تیز سانسوں کے پتھروں میں لپیٹ کر سٹیج کی طرف اچھال دیا۔

اب زپ اس کی گداز کمر کی سفید گولائیوں کو اچھالتی تیزی سے نیچے کھسک رہی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اس کے بعد وہ اچانک تماشائیوں کی طرف مڑے گی اور پھر —— ! لیکن یہ منظر آنے سے پہلے ہی وہ روز کی طرح ہال سے باہر نکل آیا اور ویرانڈے میں ٹہلتے ہوئے بولا —— "میں اپنے پاؤں سے خوف کے یہ گھنگھرو کبھی نہیں کھول سکتا۔ میں تو پیدا ہی اس کائی کے نیچے ہوا ہوں"

مرشد نے اپنی سفید داڑھی میں انگلیاں پھنسا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا —— "تو تم جاننا چاہتے ہو کہ آوازیں دینے والا کون ہے؟"

اس نے سر اٹھایا، پھر جھکا لیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا —— "کیا میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں تو اس لڑکی کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟ اور کیا اس بھرے شہر میں اس کا کوئی نہیں جو وہ یوں ہر رات تماشائیوں کے سامنے اپنے جسم کے ابھاروں کا تماشہ دکھاتی ہے"۔

اور وہ حسبِ معمول اس کے مڑنے سے پہلے ہی تیزی سے اٹھا اور بار میں آکر صوفہ پر ڈھیر ہو گیا۔

"میں بیٹھ سکتی ہوں"

اس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا ——— "جی جی"

وہ اس کے سامنے بیٹھ کر بہت دیر اس کی طرف دیکھتی رہی اور وہ سر جھکائے اپنے پاؤں میں بندھے گھنگرو کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔

"آپ" وہ جوس کی چسکی لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ——— "آپ ہر روز میرا شو ختم ہونے سے پہلے ہی کیوں اٹھ جاتے ہیں"؟

اور یہ کہتے ہوئے شرم کا شعلہ اس کے سفید گالوں کے شمع دانوں میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

"تو وقت کے بیلنے نے اس کی زندگی کے رس کو ابھی پوری طرح نہیں نچوڑا ——— "اس نے سرگوشی کی۔ "ابھی اس کے پتھر چہرے کی چلمنوں کے پیچھے ایک ننھی سی معصوم لڑکی کا چہرہ سانس لے رہا ہے"۔

اور خوشی کا کبوتر اس کے دل کے آنگن میں غٹرغوں غٹرغوں کرنے لگا۔

"میں ——— میں" اس نے جھٹک کر پاؤں سے گھنگرو نکالنے کی کوشش کی ——— "میں وہ منظر نہیں دیکھ سکتا"۔

"کیوں؟" سوال کرتے ہوئے لڑکی کے اندر کا سارا تجسس اس کے چہرے کے سائبان کے نیچے جمع ہو گیا۔

"میں نے آپ کو تقدس کے جس چبوترے پر بٹھایا ہوا ہے اس سے نیچے نہیں اتارنا چاہتا"۔

"کیوں؟ وہ شفاف میز پر اتنا جھک گئی کہ اس کے سینے کی گولائیاں گلاس سے ٹکرانے لگیں۔

"آپ مجھے اچھی لگتی ہیں" ——— اور وہ پیچھے ہٹ کر صوفے کی پشت میں گھس گیا

دونوں چپ ہو گئے،

گلاسوں میں پڑی برف قطرہ قطرہ گھلنے لگی۔

"تو میں آپ کو اچھی لگتی ہوں" اس کی آواز میں طنز یا خوشی کی بجائے ایک رستا ہوا دکھ تھا۔

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"لیکن کیوں؟ میں تو ایک ———" وہ خود ہی چپ ہو گئی۔

خاموشی کی مکڑی پھر ان کے درمیان چپ کا جالا بننے لگی۔

وہ صوفے کی پشت سے لگی، حیرت اور دلچسپی کی چلمن سے اسے دیکھتی رہی۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ـــــ" وہ چُپ ہو کر اس کے جواب کی منتظر رہی، لیکن جب وہ دیر تک اپنے کھنڈر سے باہر نہ نکلا تو بولی ـــــ آپ کون ہیں؟"

وہ چابک کھائے گھوڑے کی طرح بدک کر اپنے ملبے سے باہر نکلا ـــــ "میں کون ہوں؟ یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب مجھے معلوم نہیں"

"میں کون ہوں؟" ـــــ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور اسی لمحے اس نے پل کے نیچے چھپے ہوئے کی آواز سنی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔

"میں آ رہا ہوں ـــــ میں آ رہا ہوں" وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

لیکن جب اس نے پل کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"وہ مجھے نظر نہیں آتا، میں صرف اس کی آواز سنتا ہوں"

مرشد نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور بولا: "آواز سب سے بڑی پہچان ہے وہ بھی تو آواز ہی ہے" اس نے سر جھکا کر دل کی سونی گپھوں میں آواز کو تلاش کیا لیکن جب کچھ نہ ملا تو کہنے لگا: "پل کے نیچے تو ایک بڑی سی چمگادڑ رہتی ہے کہیں وہ ہی تو مجھے آوازیں نہیں دیتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ چمگادڑ ہے اور آواز میں ہوں"

مرشد نے کوئی جواب نہ دیا اور شہادت کی انگلی اٹھائے اوپر دیکھتا رہا۔ اس نے سر ہلایا ـــــ "یا پھر یہ ہے کہ چمگادڑ میں ہوں اور آواز وہ ہے"

آواز وقت کے بہتے پانیوں پر
سانسوں کی
سریلی بانسری ہے
اور ہم چمگادڑوں کی صورت
ہواؤں میں منڈلاتے ہیں
آواز کے سرسبز جنگلوں میں

وہ دبے پاؤں چلتا ہے
اور ہمیں پکارتا ہے
اور بڑے بڑے پوسٹروں پر لکھے ہماری پہچان کے پھسپھسے لفظ
ہمارے ناموں کی صورت
ہمارے چہروں کی دیواروں پر چپکاتا ہے
ہمیں پکارتا ہے!

اپنے نام کے لفظ پہچان کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ جنرل سٹور کی سیڑھیوں پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی
تو میں نے اپنی پہچان کے حرف اس کے دل کی ڈائری میں لکھ دیئے ہیں۔"
وہ تیز تیز قدموں اس کی طرف لپکا
کچھ دیر بعد جب وہ ریستوران میں آمنے سامنے بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے، تو وہ بولی -
"آپکے رویہ نے مجھے پریشان کر دیا ہے"
"کیوں"
وہ کچھ دیر چمچ کو پیالی کی نحر پر پھیرتی رہی، پھر کہنے لگی — "مدتوں بعد میں نے ایک مختلف شخص دیکھا ہے"
"تو میں دوسروں سے مختلف ہوں" اس کے دل کے باغ میں مور نے پر پھیلائے اور ناچنے لگا۔
"لیکن آپ نہیں جانتیں مور کے پاؤں کتنے بدصورت ہیں اور میں تو ابھی اپنے آپ کو مانجھ رہا ہوں"
"آپ ہمیشہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوبے رہتے ہیں" اس کی آواز میں تعریف تھی۔
"نہیں بالکل نہیں، میں تو کھنڈر کے ملبے میں دفن ہوں اور کھنڈر گونگے ہوتے ہیں"

زمانہ خود ایک کھنڈر ہے
جس کی بوسیدہ، ٹوٹی دیواروں کے نیچے
تاریخ کے ان گنت چہرے سسک رہے ہیں
اور ہر آنے والا
اپنے ہی ملبہ پر کھڑا ہو کر
اپنا چہرہ تلاش کرتا ہے

چہرہ پہچان تو نہیں لیکن آپ کے چہرے کے صفحوں پر مجھے اپنے خواب بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

وہ شرما گئی اور بولی — بہت دیر ہوگئی۔"

اس نے پوچھا — "پھر کب"

"شائد کبھی نہیں" وہ اداس ہوگئی

"لیکن آپ ہی نے تو کہا تھا میں مختلف شخص ہوں۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے کہا تھا ؟"

دفعتہً گھنا سیاہ بادل پر پھیلا کر آگے بڑھا گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور قریب آتی ٹیکسی کو ہاتھ دیتے ہوئے بولی — "خدا حافظ"

"اور جدائی اس راہ کا پہلا پتھر ہے" مرشد نے اپنی شہادت کی انگلی سے اس کے دل کے اندھیرے کونے کو گدگداتے ہوئے کہا۔

اس نے پوچھا "جدائی کیا ہے؟

جواب ملا — "ایک مخملی تھیلا"

اس نے پھر پوچھا — "اور یہ جدائی کس سے ہے؟"

"تم صدیوں سے یہی سوال کر رہے ہو" درخت کی سوکھی ٹہنی پر بیٹھے ہوئے گدھ نے غصے سے کہا — "کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوا کہ تم کیا ہو؟"

"میں کیا ہوں؟ اس نے خود سے پوچھا، پھر مرشد کی طرف دیکھا جو شہادت کی انگلی کی پور پر ایک ٹانگ پر کھڑا اپنا توازن درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو دراصل ہم سب اپنے آپ کو کھڑا کرنے اور توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن لڑکھڑا کر نیچے جا گرا۔

"دراصل میرے پاؤں میں موچ آگئی تھی" اس نے کہا

"تو آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا" وہ آگے جھکتے ہوئے بولی

"میں بلاتا تو آپ آجاتیں؟" وہ سراپا سوال بن کر اس کے سامنے پھیل گیا۔

وہ چپ رہی۔

"بتائیں نا"

"پتہ نہیں" وہ کھلکھلائی۔

لیکن اگلے ہی لمحے گھنا سیاہ بادل اس کے چہرے پر منڈلانے لگا

"غم ایک گھنا سیاہ بادل ہے" مرشد نے آواز کی پٹاری کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

"ہاں میں بھی اپنے سینے پر ایک داغ لئے پھرتا ہوں اور حویلی کے نیچے سے مجھے آوازیں دیتا ہے۔ شاید اس کے سینے پر بھی یہی داغ ہو"

"تم تو عجیب آدمی ہو" اس کے دوست نے جھنجلا کر میز پر ہاتھ مارا "تم ۱۹۷۵ء میں بھی کشف اور روح کی باتیں کرتے ہو"

لیکن تم ہی بتاؤ پھر پل کے نیچے سے مجھے پھر کون آوازیں دیتا ہے؟

"تم تو پاگل ہو گئے ہو" اس کا دوست اٹھتے ہوئے بولا۔

جب وہ اکیلا رہ گیا تو اس نے گریبان کھول کر اپنے سینے کے داغ کو شہادت کی انگلی سے چھوا اور اپنے آپ سے کہنے لگا: "کوئی بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا"

وہ بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

شائد میں الجھا ہوا ہوں یا شائد بالکل ہی سپاٹ ہوں"

وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر بولی—— "آپ جو کچھ بھی ہیں اچھے ہیں۔

اس کے دل میں کوئی چیز گنگنانے لگی —— "تو آپ مجھے دوسروں کی عینک سے نہیں دیکھتیں"

"نہیں"

"تو —— تو" اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا

اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بولی: "میں ایک جلا ہوا مکان ہوں اور جلے ہوئے مکانوں کی دیواروں پر اداسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا"

"جلنا اور تڑپنا اسی کے راستے ہیں" مرشد اپنی شہادت کی انگلی پر اپنا توازن ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

اس نے پوچھا: "اور یہ راستہ کون سا ہے؟"

جواب ملا: "جو تمہارے سینے کے داغوں سے شروع ہوتا ہے اور وہاں تک جاتا ہے جہاں تمہیں آوازیں

دینے والا بیٹھا ہے"

اس نے پھر پوچھا۔۔ "لیکن وہ ہے کون ؟"

مرشد نے اپنے اندر ڈبکی لگائی اور گہرے سمندروں میں ڈوب گیا۔

وہ بھی سمندر کے کنارے تک آیا لیکن اس کا سر پانیوں سے باہر رہا۔

"مَیں تو نہیں جانتا وہ کون ہے؟" اس نے اپنے آپ سے کہا

"چلو اگر تمہیں معلوم بھی ہو جائے کہ وہ کون ہے تو پھر تم کیا کرلو گے؟" اس کے دوست نے چائے بناتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"مَیں" ـــ اس نے سر اٹھا کر اپنے دوست کو دیکھا ـــ "واقعی میں کیا کرلوں گا۔

"واقعی میں کیا کروں گا؟" اس نے مرشد سے پوچھا۔

مرشد نے اس کی طرف دیکھ کر تبسم کیا اور کہا ـــ "کچھ بھی نہیں، اسلئے کہ خواہش ایک پھدکتی چڑیا ہے، جو ایک ٹہنی سے اڑ کر دوسری ٹہنی پہ جا بیٹھتی ہے۔

"تو پھر" ۔ ـــ وہ سوال بن کر ریزہ ریزہ ہو گیا

"پھر یہ کہ تم مجھ سے نہ ملا کرو" وہ دوپٹے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی

"لیکن کیوں ؟"

"اس لئے کہ تم اور میں راستے کے دو متوازی نشان ہیں، ہم چلتے چلتے تھک جائیں گے لیکن فاصلہ باہیں پھیلائے یوں ہی ہمارے درمیان کھڑا رہے گا۔

اس نے ایک لمحہ کیلئے اس کی آنکھوں میں تیرتے گھنے بالوں کو دیکھا اور بولا ـــ "یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اس طرف آجاؤ یا میں پھر اس طرف آجاؤں"

"نہیں" وہ اداس سے بولی "یہاں یہی ہوتا ہے کہ جو جس جگہ ہے وہیں رہتا ہے"

کچھ دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر وہ دھیرے سے اٹھی ـــ "شو کا ٹائم ہو گیا ہے"

وہ اپنی میز پر تنہا بیٹھا ہال میں سے آتی آوازوں کو سنتا رہا۔

اب اس کا ہاتھ اپنی زپ کا ہک کھول رہا ہو گا، اب ۔۔۔ اب ۔۔۔ اب،

وہ دوڑتا ہوا سڑک پر آگیا۔

مرشد نے پوچھا — "اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہے ہو؟"

اس نے اداسی سے سر ہلایا۔ "تاکہ سفر ختم ہو جائے۔"

مرشد نے تبسم کیا — "سفر ایک پکا داغ ہے جو تمہارے سینے پر کُھد چکا ہے۔"

اس نے اپنا گریبان کھول کر اندر جھانکا۔ اس کے سینے پر ایک بہت بڑا داغ تھا۔

اس نے مرشد کی طرف دیکھا — "میرے سینے پر بہت بڑا داغ ہے یا شاید ایک بہت بڑے داغ پر میرا سینہ ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا — "کیا اس دنیا میں ہر شخص یوں ہی ہے۔"

مرشد نے سر ہلایا۔

اس نے گریبان کے کھلے بٹن ایک ایک کر کے بند کئے اور کمرے میں آگیا۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے روز کی آواز سنی۔ کوئی پل کے نیچے اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ اس نے نیم غنودگی کے عالم میں کھڑکی میں سے جھانک کر پل کی طرف دیکھا۔ پل کے نیچے گہری گھنی تاریکی تیر رہی تھی، پھر اس نے ڈرم اور آرکسٹرا کی آوازیں سنیں۔ زپ کا ہک کھلا۔ زپ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ کمر کی گولائیاں نمایاں ہونے لگیں، پھر — پھر ایک گہری تاریکی اور اس کا نام پکارتی آواز اس نے کھڑکی کے پٹ زور سے بند کر دیئے اور کہنے لگا — "زندگی شاید ایک دھند ہے اور میں اس دھند میں تیرتا ہوا لمحہ۔"

"لمحہ کیا ہے؟" اس نے خود سے پوچھا

"شاید کچھ ہے، شاید کچھ بھی نہیں ہے۔"

اور نیند اپنی سرمئی انگلیوں سے اس کی پلکوں کے دروازوں پر دستکیں دینے لگی۔

پھسلتی ڈھلوان پہ نروان کا ایک لمحہ

اس نے اپنے چہرے کی خشک پتیوں میں سرسراتی ہوئی زردی کو آواز کے پیالے میں پھینٹتے ہوئے دوسرے کو دیکھا اور بولا ــــ " وہ جگہ بڑی عجیب ہے، بارش کی کنیاں ایک ایک کرکے نیچے اترتی ہیں۔ لیکن جب اوپر دیکھتے ہیں تو آسمان پر دور دور تک بادل نظر نہیں آتے، اسی لمحے اندھیرے کی بُکل میں سے ایک عورت نکلتی ہے اور کہتی ہے ــــ رے رانجھنا تو کہاں چلا گیا تھا اور ــــ "

"اور پھر ــــ"

"پھر یہ کہ اگلے ہی لمحے وہ عورت اپنی آواز کی طرح اندھیرے میں گھل جاتی ہے۔" جملہ ختم کرکے اس نے اپنا سر اپنے اندر ڈال لیا اور چیخ کر پوچھا ــــ "میں کون ہوں ؟"

جواب ملا ــــ "ایک خفیف ذرہ"

اس نے اپنی سوکھتی ٹہنیوں میں تازہ سبز دوڑتا محسوس کیا اور اپنا سر باہر نکال کر کہنے لگا ــــ "جب وہ رانجھنا کہہ کر اندھیرے کے تہہ خانے میں اتر گئی تو میں اسے تلاش کرتا ہوا آگے بڑھا اور گھنے جنگلوں کا آنچل ہٹاتے ہوئے کھلے میدان میں نکل آیا"

اتنا کہہ کر وہ اپنے جسم کی فصیل سے آدھا نیچے لٹک گیا اور بولا ــــ

لیکن ——— یہ میں ہے کیا — کیا میں ہوں؟"
درخت کی اس الگ تھلگ ٹہنی پر
جہاں پتیوں کی نحیف رگوں میں
موت زردی بن کر
سرسرا رہی ہے
جہاں اک ان دیکھا سر دہاتھ
جڑوں کو ریشوں سے جُدا کر رہا ہے
جہاں زندگی کے نیون سائن کے سارے رنگ
جلتا بجھنا بھول کر
اِک خاموش گھنیری چپ کی تسبیح پھیر رہے ہیں
وہاں ——— کیا میں ہوں
کیا میں ہوں

اس نے پھر کچھوے کی طرح اپنا سر اپنے اندر گھسیڑ لیا اور کچھ تلاش کرنے لگا۔ بہت دیر بعد جب اس نے سر باہر نکالا تو دوسرے نے پوچھا ——— "کچھ ملا" اس نے سر ہلایا اور بولا ——— "میرے دل کی جگہ ایک خلا ہے جس میں سے ہوا سرسراتی ہوئی گزرتی ہے۔ میں تو بس اس کی سن سناتی ہوئی سیٹیاں ہی سنتا ہوں۔"

دوسرے نے اپنی آنکھوں کی کھڈی پر فکر کی موٹی چادر بنی اور پھر اسے ادھیڑتے ہوئے کہنے لگا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارا دل پنجرہ کی طرح ہے جس میں ایک ننھا سا پرندہ بند ہے۔"
اس نے سر ہلا کر اقرار کیا اور آنسوؤں سے اپنا منہ دھوتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

اے شہر کی ٹھنڈی ہوا!
گھنے سیاہ بادلوں سے کہو کہ اپنے حاملہ پیٹ کھولیں
اور پانیوں کے تازہ بچے
ہماری کھلی گودوں میں ڈالیں

ہم جو بھیگنے کی دعائیں لے کر مسلسل چل رہے ہیں
ہمارے پاؤں کے تلوؤں میں
اک ایسی پھسلن چھپی بیٹھی ہے جو ہمیں
رکنے نہیں دیتی
اے بے مروت بارشو
ہم پر برسو —— خوب برسو
کہ ہمارے جسموں کی مٹی جھرنے لگے
اور ہمارے اندر چھپا ہوا
سنسان، تنہا کھنڈر باہر نکل آئے
اور اس میں چھپا
وہ ننھا سا خوب صورت پرندہ
پھڑ پھڑا کر اڑ جائے
آسمان کی نیلی وسعتوں کی سمت
اپنے گھر کی طرف —— !

دوسرے نے اپنے ہاتھ نیچے گرا لئے اور بولا —— "اسے رہائی مبارک ہو" اس نے اَن سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "میدان کے بیچوں بیچ ایک ٹیلے پر وہ مقبرہ تھا میں آہستہ آہستہ اس کے قریب چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اندر جانے سے پہلے مجھے لگا میں کسی کھنڈر کی دہلیز پر کھڑا ہوں"۔
یہ کہہ کر اس نے افسوس سے دونوں ہاتھ ملے اور کہنے لگا —— "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک کھنڈر ہوں جس پر گوشت کی تہہ چڑھا دی گئی ہے —— میں اپنے اندر سے کھوکھلا ہوں"
اس نے پھر اپنا سر اپنے اندر ڈالا اور چیخ کر بولا —— "اگر میں کچھ نہیں تو پھر وہ کیا ہے ؟"
"وہ" —— دوسرے نے لفظوں کو اپنی بھوکی زبان سے چاٹا —— "وہ —— وقت ہے۔
جو موسموں کے تند کلہاڑوں سے ہمارے جسموں کو دتا ہے کہ ہم اس کی تعریف میں گیت گائیں۔
اور پھر سیکنڈوں، منٹوں اور گھنٹوں کی تیز چکی میں پس کر

ریزہ ریزہ ہوجائیں

"تو وہ بھی میری طرح شک کی مٹھیوں میں ہے" اس نے اپنا سر باہر نکالا اور بولا "تو میں مقبرے کے اندر چلا گیا۔ ایک ویران سی قبر کے سرہانے وہی عورت بال کھولے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اوپر دیکھا۔ مقبرے کا اوپر والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ عورت مجھے دیکھ کر ہنسی اور قبر کی چادر ہٹا کر اندر چلی گئی"

دوسرے نے اس کے خاموش ہوتے ہی اپنا سوال اس کے آگے پھینک دیا —— "رشتوں اور چہروں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

"رشتے اور چہرے

سبز مخملی کپڑوں میں لپٹی اس زمین پر

جڑواں بھائی ہیں

اور جدائی

سفر کی صورت

ایک پھسلتی ہوئی ڈھلوان ہے

"جب وہ عورت قبر کی چادر ہٹا کر اندر چلی گئی" اس نے ٹوٹے ہوئے قصے کے تار جوڑتے ہوئے کہا —— "تو میں آگے بڑھا۔ تازہ آسمان گنبد کے کھلے منہ میں سے جھانک رہا تھا۔ میں نے خود سے کہا —— بھلا یہ گنبد کھلا کیوں ہے؟"

عورت نے قبر کی چادر ہٹا کر منہ باہر نکالا اور بولی —— "چھتیں ڈائنوں کی طرح ہیں جو آزادیوں کے نوزائیدہ بچوں کو کھا جاتی ہیں"

"کیا وہ خوب صورت تھی؟" دوسرے نے پوچھا

"ہاں! حسن اس کے چہرے پر منجمد ہوگیا تھا"

"کیا وہ بھی حسن ہے؟" اس نے خود سے پوچھا —— "اور کیا حسن بھی عمر کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور کیا وہ بھی فنا کی پھسلتی ڈھلوان پر ہے؟" اس نے افسوس سے دونوں ہاتھ ملے ——

جواں دہکتے چہرے لمحہ بھر کے لئے

ہمارے سامنے آتے ہیں،

اور پھر بوڑھی زر دستہ کا وٹ انہیں ہم سے

چھین کرلے جاتی ہے

اور پھر عمر کی بھٹی میں پگھلا کر

جب انہیں دوبارہ ہمارے سامنے لاتی ہے

تو وہ بنجر گوشت کا بانجھ لوتھڑا

ہوتے ہیں

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حسن بھی نہیں، وہ عمر بھی نہیں، کہ عمر تو خود وقت کے ہاتھوں میں ایک پھسلتی ہوئی رسّی ہے، تو پھر وہ کیا ہے؟"

دوسرے نے شانے ہلاتے اور بولا ——

شاید وہ خود زندگی کی آنکھ سے گرا

ہوا آنسو ہے

جو وقت کے موٹے کرتے میں جذب ہو گیا ہے

اور اب

ہماری سانسوں کی پتوار سے چپکا

ہم سے اپنے نام کی گواہی لے رہا ہے

اور ہمارے لفظوں میں

اپنے نام کے حرف ڈھونڈھ رہا ہے

"پھر یہ ہوا کہ میں قبر کے قریب چلا گیا"

"پھر" —— دوسرے نے تجسّس سے پوچھا

"پھر میں نے قبر کی چادر ہٹا کر اندر جھانکا، اندر اندھیرا تھا، میں قبر کے اندر اتر گیا، سیڑھیاں تاریکی کے پیٹ میں نیچے بہت نیچے تک گئی ہوئی تھیں میں ایک ایک کر کے نیچے اترتا رہا۔ پھر تاریکی نے اپنے بازو کھولے۔ درمیان میں ایک چبوترا تھا جس پر —— !"

وہ چپ ہو گیا

"جس پر" دوسرے نے جلدی سے پوچھا

"کوئی بھی نہیں تھا"، لفظ اس کی زبان پر اٹک گئے ۔۔ "قبر خالی تھی"

"کوئی بھی نہیں تھا" دوسرے نے بیتابی سے پوچھا — پھر — "

"میں نہیں جانتا، میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

وہ چیخنے لگا — "وہ کیا ہے اور کہاں ہے، میں کون ہوں اور کیا ہوں؟"

دونوں زور زور سے چیخنے لگے۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔

بہت دیر بعد دونوں نے سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک دوسرے کے قریب گئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے سر بدلے، اپنی آنکھیں بدلیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے

وہ بولا —

وقت کے ہونٹوں کی ٹہنیوں پر ہمارے نام
کی کونپلیں پھوٹتی ہی نہیں
اس کی ونجلی کی لے میں ہمارے جسموں کا شہد
گھلتا ہی نہیں
ہمارے لئے زندگی اب کورے کاغذ کی طرح ہے
کہ ہم جس بوڑھے شہر میں رہ رہے ہیں
اس کی ہوا بھی حاملہ ہو چکی ہے

اور اب

ہمارے سروں پر چیختے چنگھاڑتے
منڈلاتے ہوئے
آنے والے بچے کی اذیت کا دکھ سہہ رہی ہے
اور کہہ رہی ہے
ہم سب بانجھ چالاک لفظوں کی مملکت میں

اک بے چہرہ عصر کی بے صدا آوازیں ہیں
اور کچھ بھی نہیں
صدا اور زمانہ دونوں جڑواں بھائی تھے
لیکن اب دونوں کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے
زمانہ اب میلے کاغذوں پر لکھا ہوا اک بے معنی گیت ہے
جس کے ترنم کی سب طنابیں ٹوٹ چکی ہیں
اور آواز ——— آواز تو اب
مشینوں کے چلنے، بند ہونے کا ایک طے شدہ عمل ہے
جس میں زاویوں کے بدلنے، رنگوں کے پھیلنے
اور راتوں کے طشت پہ ناچنے چاند کی کوئی کہانی نہیں ہے
اب سیاہ رات ایک بانجھ عورت کی طرح
روشنی کو حسد کی سلائیوں سے چھیدتی ہے
اور ہم
ہم جو یہ سب دیکھتے ہیں
شہادت کی انگلی سے ہونٹوں کے کھلے دروازوں پر چپ کی مہر لگا کر آنے والے لفظوں کی بصارت
چھینتے ہیں۔
کہ ہونٹوں کی چلمنوں کے پیچھے چھپے ہوئے سارے لفظ
اب فاحشہ عورتیں ہیں

وہ چپ ہوا تو دوسرا بہت دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا ——— افسوس میں نے تمہیں رہائی کی
جو مبارک دی تھی وہ ضائع ہوئی کہ ہم تو ابھی تک اسی طرح قید ہیں
"ہاں" ——— اس نے سر ہلایا ——— "ہم لفظوں کی اس مملکت میں "ہے" اور "نہیں"
کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور لفظ ——— لفظ تو اب فاحشہ عورتیں ہیں"
اور وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر بلک بلک کر رونے لگے۔

لا = ؟

اس نے اپنے آپ کو سزا دی ہے،

کہ زہر کا پیالہ پی لے، یا جلا وطن ہو جائے، لیکن بزدلی بچپن ہی سے اس کے دل کے آنگن میں گڈاں مارتی چلی آئی ہے اور موت نے کئی بار اس کے گھر پہ شب خون مارا ہے۔ اس لئے اس نے جلا وطن ہونے کو ترجیح دی ہے، لیکن جانے سے پہلے وہ رشتوں کی ان تمام ڈوریوں کو کاٹ پھینکنا چاہتا ہے جن سے اس کی زندگی کی کشتی کا مستول بندھا ہوا ہے۔

وہ کئی سالوں سے سیدھی سادھی زندگی گذار رہا تھا کہ ایک دن ایک چیل اڑتی ہوئی آئی اور اس کے کندھے پہ بیٹھ گئی۔ اس نے چیل کو اڑانے کی بہت کوشش کی، لیکن چکر کاٹ کر وہیں آ بیٹھی اور اپنی چونچ سے اس کے جسم پہ بے اطمینانی کے بیج اگانے لگی۔ اس دن وہ اس ڈر سے باہر نہیں نکلا۔ کہ لوگوں کی آنکھوں کی تسبیح میں پروئے ہوئے سوالوں کے جواب کہاں سے لائے؟ لیکن جب رات نے دیواروں پہ دستک دے کر اندھیرے کے مشکیزے کا منہ کھولا تو اس نے چیل کو اڑانے کی ایک کوشش اور کی، لیکن چیل سیاہی کی جیکی لے کر وہیں آ بیٹھی، اس رات بے خوابی اس کے بستر پہ ناچتی رہی۔ صبح جب روشنی نے رات کے ٹھٹھرتے بدن پر کرنوں کی چادر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ چیل ساری

رات اس کے جسم کو اپنی چونچ سے کھودتی رہی تھی اور اب آلنا بنا کر اس کے دل پر بیٹھ گئی تھی۔
اس کی چونچ اس کے ہونٹوں پر
اس کے کان ، اس کے کانوں میں
اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں
اور اس کا جسم اس کے جسم میں رچ بس گیا تھا
وہ لوکھلا کر باہر بھاگا
لوگوں کے جسموں میں دھوئیں کے تنور لگے ہوئے تھے، اور ان کے مساموں سے بدبودار شے رس رہی تھی۔

اس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا ——— اس کے نتھنوں نے ایک نئے احساس کو سونگھا۔ اس نے قریب سے گذرتے ہوئے ایک شخص کو ٹھونگا مارا۔ اس شخص نے مڑ کر دیکھا اور ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔
اب تم ہی بتاؤ ، میں کیا کروں ؟
اذیتیں میرے راستوں کے سبھی موڑوں پر چھپی ہوئی ہیں
گھات لگائی بیٹھی ہیں
اور میں قطرہ قطرہ مر رہا ہوں
میں اس شہر میں جہاں ہر شخص اپنی خوشبو چھوڑ چکا ہے
اپنے خوشبودار جسم کے ساتھ کیسے رہوں ؟
کل وہ مجھے ملا تھا
میں نے پوچھا ——— "کیسے ہو ؟"
کہنے لگا ۔"چیل اڑ گئی ہے وہ مجھے چھوڑ گئی ہے ۔"

خوف اور اذیت کے جہاز ساری رات اور سارا دن اس کی پلکوں کے رن وے اپنے پہیئے چھواتے رہتے ہیں اور ایک ان دیکھا دکھ کاک پٹ سے اچھل کر باہر نکلتا ہے اس کے شعور کی باڑیں پھلانگ کر اس کے وجود کے گلی کوچوں میں دوڑتا رہتا ہے ۔

یہ جانے کتنی ویں رات ہے کہ اس کا جسم اسے بستر کی گود میں لیں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گیا ہے۔ ان

ساری گزری ہوئی راتوں میں وہ اسی طرح خوف اور اذیت کے میدان میں فٹ بال کی طرح ایک ٹھوکر سے دوسری ٹھوکر پر ناچتا رہا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ یہ عہد کرکے سوتا ہے آج رات وہ اپنے جسم کو باہر نہیں جانے دیگا لیکن آدھی رات کو باہر سے آواز آتی ہے اور اس کا جسم اسے چپکے سے ایک طرف کرکے باہر نکل جاتا ہے۔

اس نے مجھے بتایا کہ آدھی رات کو وہی چیل اسے آواز دیتی ہے

"تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے؟ کیا اب بھی بیعت نہیں کروگے؟"

اس کے ہونٹوں میں پھیکی مسکراہٹ کا نغمہ پھوٹا اور وہ مری ہوئی آواز میں بولا — "میری آنکھوں میں ابھی دوسرے نہیں آتے"

"آواز گونجتی ہے تو زندگی جاگ اٹھتی ہے" — یہ بات اس نے کئی دن پہلے مجھ سے کہی تھی۔

میں نے پوچھا تھا — "آجکل کہاں رہتے ہو، نظر نہیں آتے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا — "پتہ نہیں"

پھیلے ہوئے بے سمت فاصلوں کے
اندھے پیٹ میں
وہ رفتار کی ٹھہری ہوئی سوئی میں پرو دیا
ہر روز اپنی چونچ سے اپنی قبر کھودتا ہے
اور اپنے پروں سے مٹی اڑاتا ہے
وہ مٹی
جو اس کے بدن سے لمحہ بہ لمحہ جھڑ رہی ہے
ہر نئی صبح کا سورج
زیرو کے بلب کی طرح، بے بسی سے
اس کے جسم کی گھنی تاریک راہداریوں میں
منٹوں، سیکنڈوں اور گھنٹوں کی خیرات بانٹتا ہے
اسے ایک اور دن زندہ رکھنے کے لئے

سانسوں کا انجکشن لگاتا ہے
"کسی سے خوف زدہ ہو؟"
"ہاں"
"کس سے"
"میں نہیں جانتا، میں صرف اس کے قدموں کی چاپ سنتا ہوں"
آواز — آواز — آواز
ہونہہ
اب تو آوازیں ردی کاغذوں کی طرح بے اثر ہو چکی ہیں اور گندی ٹوکریوں میں دم توڑ رہی ہیں
زبانوں پر زہر کے سرکنڈے اگ آئے ہیں
ہونٹوں کی بیلوں پر منافقت کی بیلی پتیاں کھل اٹھی ہیں
مکانوں میں تو اب صرف سائے سرسراتے ہیں
اور بدنوں کی چاردیواریوں میں شک کے محل ٹھہر چکے ہیں
"تو اب تم شاعری کرنے لگے ہو؟"
"شاعری — یہ شاعری ہے، مجھے تو نہیں معلوم"
"آج کل کیا سوچ رہے ہو؟"
اس نے کندھے جھٹکے — "پتہ نہیں"
خوف اور اذیت کا یہ کھیل اب دن کی روشنی میں اپنی پہچان کرانے لگا ہے۔ اس کا جسم اب دن کو بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وہ جب بھی اسے پکڑنا چاہتا ہے تو جسم ہاتھ پکڑ کر اسے پرے کر دیتا ہے، اور کہتا ہے — "مجھے زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنے کے لئے مجھے وہی کچھ کرنا پڑے گا جو دوسرے کرتے ہیں۔ ورنہ تم ہی کوئی راستہ بتاؤ"
اس کے پاس کوئی جواب نہیں
کوئی راستہ نہیں
کہنے لگا — "اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہر سانس کے ساتھ ہوا کی بجائے اذیت میرے اندر جاتی ہے"

میں نے کہا ـــــ "تو بیعت کر لو"

اس نے انکار میں سر ہلایا ـــــ "ابھی میں نے دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنا اور دوسروں کے کانوں سے سننا نہیں سیکھا۔"

سرکنڈوں میں بیٹھی ہوا
سیٹیاں بجا بجا کر پوچھتی ہے،
تم کون ہو ـــــ تم کون ہو؟
آؤ میرے ہاتھ پر بیعت کرو
چلو میرے ساتھ چلو
آؤ میں تمہیں منافقت کے دودھ میں
گندھی ہوئی روٹی کھلاؤں
اس گندے جوہڑ کا پانی پلاؤں
جہاں لحہ بہ لحہ رنگ بدلنے والے مگرمچھ رہتے ہیں
"اب تم ہی بتاؤ میں کہاں تک خود کو بچائے رکھوں۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے پکڑ لئے اور بولا ـــــ "جب میں پیدا ہوا تھا تو میرے باپ نے میرے کان میں اذان دی تھی۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا ـــــ "تمہارے باپ نے بھی تمہارے کان میں اذان دی تھی۔"

میں نے کہا ـــــ "مجھے تو یاد نہیں۔ اگر دی بھی تھی تو میں اسے بھول گیا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا ـــــ "لیکن میرے کانوں میں تو وہ آواز اب بھی گونجتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں۔"

"شاید یہ ٹھیک ہے اسی لئے تمہیں آس پاس کی ہر شے اجنبی لگتی ہے یا پھر یوں ہے کہ تم پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے اور اب پھر پیدا ہوتے ہو" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا ـــــ "کیا کوئی شخص ایک ہی زندگی میں دوسری بار پیدا ہو سکتا ہے۔"

"ہم ہر روز پیدا ہوتے اور ہر روز مرتے ہیں۔ میری دادی کہا کرتی تھیں - آدمی جس روز پیدا ہوتا ہے.

اسی روز اس کی قبر بھی کھد جاتی ہے اور ہر رات کو قبریں اپنے اپنے آدمی کو پکارتی ہیں اور کہتی ہیں

اے میرے محبوب

دیکھ میں تیرے فراق میں پہاڑ ایسی کالی راتیں

کس بے کلی سے کاٹ رہی ہوں

آ میرے سینے سے لگ جا

"آ - آ - آ —"

"یار تمہاری دادی بڑی عقلمند عورت ہے۔ اب وہ کہاں ہے۔ میں اس سے اپنے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"اس نے اپنی قبر کی آواز سن لی تھی"

"لیکن اب قبروں کی آوازیں کون سُنے گا؟ اب تو سب نے اپنے کانوں میں پگھلا ہؤا سیسہ ڈال لیا ہے"

"ہاں اب تو ہم دوسروں کے کانوں سے سنتے ہیں"

"اچھا ایک بات بتاؤ؟"

"پوچھو"

"کیا اس شہر کے سارے لوگ میلے پر آئے ہوئے ہیں؟"

"کیوں؟"

کسی کو کسی چیز کی فکر ہی نہیں۔ دیکھو نا رات، سورج کا کلیجہ چبا کر اب اس کی ہڈیوں میں سرسرا رہی ہے، لیکن کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں۔"

"ہم سب دوسروں کے BAT MAN (تابع مہمل) ہیں۔"

"اور دوسرے"

"وہ پہلوں کے"

"اور پہلے"

"پہلے ان سے بھی پہلوں کے"

"گویا ہم سب دوسروں کے BAT MAN (تابع مہمل) ہیں"

"آؤ مل کر ہنسیں ـــــ ہا ہا ہا"

"ہا ہا ہا"

"رات، سورج کا کلیجہ چبا کر اب

اب اپنے پنجوں سے ہمارا گوشت نوچ رہی ہے"

وقت کی تسبیح سے ہمارے نام کے دانے

ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے ہیں

ایک دو ـــــ تین چار

ایک دو ـــــ تین چار

ایک دو ـــــ تین چار، کئی طویل ٹھٹھرتی ہوئی راتوں کو آنکھوں کی گودیوں میں اتار اتار

کر اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ زہر کا پیالہ پی لے یا پھر جلا وطن ہو جائے۔

تو کیا وہ سچ مچ جلا وطن ہو جائے

اسے اس شہر سے بڑی محبت ہے وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا، کسی حالت میں بھی

تو پھر زہر کا پیالہ پی لے، لیکن بزدلی تو بچپن ہی سے ـــــ!

منجمد اندھیرے میں روشنی کی ایک دراڑ

ریستوران کی سب سے اوپری منزل میں وہ چار تھے۔

کونے والی میز پر بیٹھا ہوا بوڑھا، اپنی پلکوں پر عمر کا سفید بُت سجائے برسوں کے گھسے ہوئے منکوں سے خبروں کا ورد کر رہا تھا۔ درمیان والی میز پر بیٹھی لڑکی، لذت کی تازہ اور میٹھی رس بھری کھجوریں کھاتے ہوئے شوق کی گٹھلیاں ایک ایک کر کے اس کے وجود کے خالی ڈرم میں پھینک رہی تھی اور وہ خود جو اپنی خواہشوں کے تنور میں لگتی روغنی روٹیوں کی مہک تو محسوس کر سکتا تھا لیکن انہیں اتار نہیں سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ جلتے تھے۔

ریستوران کی اس سب سے اوپری منزل میں وہ چار تھے

ایک وہ بوڑھا، جو عمر کے سوکھے ہونٹوں سے وقت کا سفید گف سیرپ چک رہا تھا۔ دوسری وہ لڑکی جو وقت کے ٹینس کورٹ میں عمر کے چھکے سے نکلی ہوئی گیند کی طرح لذتوں کے ڈھلوان پر لڑکھڑاتی چلی جا رہی تھی اور وہ تیسرا وہ خود جس کی آنکھوں کے پیچھے سے لٹکی انتظار اور شوق کی بیلیں ٹیڑھے ٹیڑھے مرجھا بھی گئی تھیں —— یہ ہوئے تین تو چوتھا کون تھا؟

چوتھا تھا تو ضرور، لیکن کس میز پہ؟

اس کی آنکھیں میزوں کے شفاف اور ڈھلوان چہروں پر پھیلنے لگیں۔ شاید چور تھا آدمی میز کے نیچے گھس گیا تھا۔

تو یہ لڑکی ـــــ اس کمرے میں دوسری تھی، شاید جرمن تھی یا سوئس یا پھر؟ کہیں کی بھی ہو۔ عورت کی کوئی جغرافیائی پہچان نہیں۔ بستر میں ساری عورتیں ایک سی ہوتی ہیں۔

لیکن اس کے پاس کیا تھا؟ اس شہر میں تو وہ پردیسی تھا، ایک ٹورسٹ، جو دنیا کو فاصلوں کی گرد سے نکالنے نکلا تھا۔ سفر کی لذتیں چکھنے کے لئے اس کے پاؤں مدتوں سے بے چین تھے اور اب کہیں جا کر اس کی یہ خواہش حقیقت کے رنگین لباس میں اس کے سامنے آئی تھی۔ اسے اپنے شہر سے نکلے کتنے دن ہوئے ہیں؟ اس نے انگلیوں کے پوروں پر وقت کے نشان کو لپیٹنے کی کوشش کی۔ جتنے دن بھی ہوئے ہوں، اس وقت تو وہ اس ریستوران کی سب سے اوپری منزل میں ان تینوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"لیکن یہ چور تھا کدھر گیا؟" ـــــ اس نے میزوں کے چمکتے ہونٹوں سے سوال کیا۔ پھر دوبارہ سب کو گنا ـــــ ایک وہ بوڑھا، جو سر پر عمر کی سفید کلغی سجائے اخباروں کی تہوں میں گزرے ہوئے سال ڈھونڈ رہا تھا۔ دوسری وہ لڑکی، جس کی آنکھوں میں بھد کتی شوق کی چڑیاں بار بار ـــــ اس کے جسم کی ٹہنیوں پر منڈلا رہی تھیں اور تیسرا وہ خود ـــــ کیا چور تھا ابھی تک میز کے نیچے ہی تھا؟ کیا اس کے پاس بل دینے کے لئے کچھ نہیں؟

اس نے کندھے جھٹک کر ان پر بیٹھی ہوئی فکر کی چڑیوں کو اڑایا اور شیشے کی دیوار سے لگ کر نیچے سڑک پر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگا۔

لڑکی نے مینو ایک طرف کر دیا اور جھک کر اس کو دیکھنے لگی۔ لڑکی کی آنکھوں میں شناسائی کا چرخہ چل رہا تھا۔ اس کی گھوں گھوں سن کر وہ پرانے سوئیٹر کی طرح ادھڑنے لگا اور دھاگا دھاگا ہو کر اس کے دل کے تکلے پر لپٹنے لگا۔

بوڑھا ان دونوں سے بے نیاز اخبار کے کالموں میں تیر رہا تھا، لیکن چور تھا ـــــ ؟

لڑکی ذرا سا ترچھا ہو گئی۔ پھر اس کی آنکھوں نے کھلکھلا کر انگڑائی لی اور اس کی خواہشوں کے گھنگھروؤں کی تال پر ٹھمک ٹھمک ناچنے لگی۔

ہنسی اس کے اندر ہی اندر پھیلی اور رسمتی۔ اس کی آنکھوں میں اگی ہوئی زبانیں شیشے کی دیوار سے

پھسلیں نیچے سڑک پر اتریں اور شوکیسوں میں سجی چیزوں اور بھاگتی کاروں کو بوسے دینے لگیں اسے نیچے جاکر بہت سے چیزیں خریدنا تھیں۔ لوگ باہر جاتے ہیں تو بہت کچھ لاتے ہیں۔ وہ بھی واپسی پر بہت سی چیزیں ان شوکیسوں کی گود میں سے نکال لے جائے گا۔

لڑکی مینو سے کھیل رہی تھی۔ شائد بیرے کا انتظار ہو۔ لیکن بیرا اتنی دیر سے نچلی منزل میں کیا کر رہا تھا؟ کہیں اسے معلوم تو نہیں ہو گیا کہ چوتھا میز کے نیچے چھپا ہوا ہے؟ شاید وہ کسی اور کو بلالائے اس نے رک رک کر ساری کرسیوں کو گنتی کی تسبیح میں پرو دیا۔

چوتھا اس خوبی سے چھپا تھا کہ کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کوئی بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکے گا۔

اس کے ذہن میں اطمینان نے کنڈل مارا اور وہ گنگنانے لگا۔ لڑکی کن انکھیوں کی چلمن سے اسے دیکھ رہی تھی وہ اچھل کر اس کی پلکوں کی ٹیرس سے لٹک گیا۔ پھر دھیرے سے اس کی آنکھوں کے برآمدے میں اترا اور ان میں جلتی خوشبوؤں کو اپنے بدن پر لپیٹ کر غڑم سے اس کے اندر کود گیا

یہ اجنبی لڑکی ——— اور یہ اجنبی شہر

اس اجنبی شہر کی تازہ ہوا، اس کے زنگ آلود پھیپھڑوں میں سانسوں کے پیا نو پر زندگی کے نئے سروں کی دستک دے رہی تھی۔

یہ اجنبی شہر

جب تم پر پھیلی ہوئی زندگی کی شفیق بانہیں سمٹ جائیں تو ہجرت کرو
لیکن ہجرت کے لئے تو پاسپورٹ چاہیئے، فارن کرنسی چاہیئے، کرایہ چاہیئے۔

اور ——— اور خدا جانے کیا کیا چاہیئے۔

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز نے اسے خیالات کے مچان سے نیچے گرا دیا۔

شاید بیرا کسی کو لے کر آرہا تھا؟

تو چوتھا۔ ———

اس نے جلدی جلدی سر گھما کر چاروں کونوں کی خبر لی، چوتھا بڑی خوبی سے کسی میز کے نیچے چھپا ہوا تھا۔

شائد وہ اسے نہ پکڑ سکیں — یقیناً نہیں پکڑ سکیں گے

کھٹک ——

بل میز کی گود میں سے پھسلتا ہوا اس کی آنکھوں کی چار دیواری میں آگرا۔ اس کے لرزتے ہاتھوں نے جیب کی اندھیری گہرائیوں میں چھپے ہوئے سکوں کو آواز دی اور انہیں گنتی کی شباہت میں ڈھال کر بل کے کھلے منہ میں ڈال دیا۔

لڑکی آنکھوں کی پلیٹ میں لذت کے رس گلے سجائے اسے دیکھ رہی تھی۔ شائد وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اسے اپنی آنکھوں کے پنگھوڑے میں بٹھا کر یوں لوریاں دی تھیں۔ تو کیا وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے؟ اس نے کئی سفرناموں میں اس مرحلہ کو بار بار پڑھا تھا۔ جب کہانی سنانے والا اپنے آپ کو جبر کی ہتھیلیوں میں مسلتے ہوئے اس لڑکی کو الوداع کہتا ہے جو اسے ایسی ہی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہوتی ہے۔

تو اس کا مطلب ہے کہ اب الوداع کی گھڑی آن پہنچی۔

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا —— "اچھا تو اے اجنبی لڑکی الوداع"

لڑکی نے اسے اپنی آنکھوں کے سایوں میں سمیٹا اور بولی —— "کچھ دیر تو اور رکو"

"نہیں —— مجھے جانا ہے"

اس نے مڑنے سے پہلے سارے کمرے کو اپنی آنکھوں کے آنگن میں سمیٹا۔ عمر کے طوطے کو پچکارتا بوڑھا، عمر کی رنگین تتلی کے پیچھے بھاگتی لڑکی، اور الوداع کی انی پر کھڑا وہ خود —— اسے چوتھے کا خیال آیا۔

اس نے کمرے کی ایک ایک شے کو ٹٹولا —— تو وہ ابھی تک میز کے نیچے چھپا بیٹھا تھا۔

"اچھا تو الوداع" —— وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا

سیڑھیاں اترتے ہی اسے بیرے کی آواز سنائی دی —— "پتہ نہیں کہاں سے آجاتے ہیں —— ہونہہ"

اچھا تو چوتھا —— آخر بیرے نے میز کے نیچے تلاش کر ہی لیا۔

سیڑھیوں کے آخری زینے نے اسے سڑک کی جھولی میں دھکیل دیا۔

"ارے تمہاری تو آج درخواست آئی تھی کہ بیمار ہو"
اس نے مڑ کر دیکھا اس کے دفتر کا ایک ساتھی اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہا تھا۔
"درخواست!" ـــــ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر بڑبڑاہٹ کی کونپلیں پھوٹیں، پھر کچھ سوچتے ہوئے، جیسے اچانک کوئی چیز اس کی یاد کی جھولی میں آن گری ہو، بولا ـــــ "اچھا اچھا، سمجھ گیا تم چوتھے آدمی کی بات کر رہے ہو، وہ اوپر ہے اور بیرے نے اُسے پکڑ لیا ہے۔"

شام، پھول اور لہو

وہ ان میں سے ایک تھی، جنہیں مجھے قتل کرنا تھا،

وہ کل شام میرے بدن کی دیوار سے لگ کر چیخنے لگا —— "خدا کے لئے اسے قتل کر دو"

میں نے کہا —— "لیکن مجھے تو قتل کرنا آتا ہی نہیں"

اس نے دراڑوں میں انگلیاں پھنسا دیں —— "بس کسی طرح اسے قتل کر دو، ورنہ میں مر جاؤں گا"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا —— "بات کیا ہے؟"

کہنے لگا —— "میں جب صبح اٹھتا ہوں تو میرے منہ پر بالوں کی بجائے لڑکیاں اگتی ہیں"

میں نے سر ہلایا —— "تو اس میں خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ کوئی اچھا سا بلیڈ استعمال کرو"

اس نے شانے اچکائے —— "وہ تو کرتا ہی ہوں۔ لیکن اب تو میری ہتھیلیوں اور انگلیوں کے پوروں پر بھی وہ اگ آئی ہیں"

اس نے ہتھیلی پھیلا دی، میں نے دیکھا۔ چہرے اس کی ہتھیلی کی ریکھاؤں سے اگتے ہیں اور کھلکھلا کر بھاگ جاتے ہیں۔

"دیکھا —— دیکھا تم نے" اس نے میرے بازو سے لٹکے لٹکے اچھل کر پاس سے گزرتی ہوئی خوشبو

کو چاٹتے ہوئے کہا۔

میں نے باقی خوشبو کو اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھا —— "لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، میں تو خود اناڑی ہوں۔ ایک بار قتل کرتے ہوئے خود قتل ہوتے ہوتے بچا تھا۔"

اس نے میرے بازو کو دباتے ہوئے تیز سی سسکی بھری —— "کچھ تو کرو"

میں نے بے بسی سے سر ہلایا۔ مجھے اپنی عادت معلوم ہے کہ اسے بچاتا بچاتا میں خود مارا جاؤں گا۔ دلدلیں مجھے آوازیں دیتی ہیں اور جب تک ان میں پوری طرح دھنس نہیں جاتا مجھے اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

میں اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ سوال بن کر میرے ساتھ لٹک رہا تھا۔

آخر تنگ آکر میں نے کہا "تو چلو"

اس کے چہرے سے چمٹی ہوئی اداسی ڈھل گئی۔ ہم دونوں ہجوم کے دریا میں اتر پڑے اور سڑک کی کشتی کو پاؤں سے کھیتے ایک چوک سے دوسرے چوک کو عبور کرتے رہے۔ لیکن جب بڑا چوک آیا تو دفعتہً مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ میرے ہاتھ میں اس کی انگلی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ سرخ بتی سے چمٹا پچھلے چوک کے گرداب میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

شام کو جب وہ آیا تو اس کا چہرہ گرد نیا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا —— "کیا ہوا ہے؟"

اس نے کندھے جھٹکے اور دانت نکوس کر صوفے پر گر پڑا۔

میں نے کہا —— "چلو ٹیکسلا چلیں —— سنا ہے وہاں آج کل ٹوٹے چل رہے ہیں۔"

وہ اچھل کر میرے سینے سے لگ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

حیرت میری آنکھوں کے پیالوں میں گھلنے لگی —— "کیا ہوا —— کیا ہوا؟"

کہنے لگا —— "میں وہاں گیا تھا، باہر بورڈ لگا ہے۔ نئی انتظامیہ، صاف ستھرے ماحول میں مع خاندان تشریف لائیں۔"

"پھر"

"پھر" —— اس نے آنسو پونچھے —— میں نے آنسوؤں کو سونگھا اور جب انہیں پکڑنے کی کوشش کی تو وہ دیوار کی اوٹ میں چھپ گئیں، اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں، اب تو یہ کھنڈر بھی

ہمارے نہیں ہے۔"

میں نے کہا — "کتابوں میں یوں لکھا ہے۔ کہ وہ گھات لگا کر پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ اور شمال سے اٹھتی ہوئی گرد کو دیکھنے لگے۔ جب گرد کا گنبد قریب آیا تو رنگوں کے چشمے صاف نظر آنے لگے وہ نعرہ مار کر اپنی جگہ سے نکلے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ پھر انہوں نے ایک ایک رنگ کو اپنی پلکوں سے چنا اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے جنگل میں اتر گئے۔"

وہ دوبارہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں نے پوچھا — "اب کیا ہوا؟"

اس نے اپنے سینہ پر دوہتڑ مارا — "کل میں سارا دن اپنی کھڑکی سے لٹک کر پڑوس کے صحن سے رنگ چننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن رنگ میری پلکوں سے چھوتے ہی اپنی خوشبو چھوڑ دیتے ہیں۔"

پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے — "اسے قتل کر دو، ورنہ میرے سارے جسم پر چہرے اگ آئیں گے۔"

رات چنگھاڑتی ہوئی ہم پر ٹوٹ پڑی تھی۔

باہر سردی ننگی دیواروں سے لپٹ رہی تھی اور ساتھ والے کمرے میں وہ اسے قتل کر رہا تھا۔ اس کی چیخیں درمیان والے دروازے کی دہلیز سے نکل کر سارے فرش پر رینگ رہی تھیں۔ ہوا اس کے لہو کے رنگ کو ہاتھوں میں اٹھائے میرے چاروں طرف ناچ رہی تھی۔ میں نے فرش پر رینگتی چیخوں کو دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں بھرا، اور پھر ایک ہی لمحہ میں انہیں اپنے منہ میں انڈیل لیا۔ چیخیں کرچ کرچ ہو کر میرے پیٹ کے اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ پھر میں نے ہوا کے ہاتھوں سے اس کے لہو کے رنگ کو اپنے منہ پر ملا اور ایک نعرہ مار کر ساتھ والے کمرے میں جا گھسا۔ لاش پلنگ کے بیچوں بیچ پڑی تھی اور خون چادر پر اپنی تصویر بنا رہا تھا۔ میرا نعرہ سن کر لاش میں ایک لمحہ کیلئے حرکت ہوئی اور پھر وہ اسی طرح خون کے تھال پر تیرنے لگی۔

صبح جب سورج کی کرنوں نے دیواروں پر چپکی ہوئی سردی کو کھرچ کھرچ کر اتارنا شروع کیا تو لاش اپنے آپ کو سمیٹ کر باہر کی طرف دوڑی۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ لیکن تیز روشنی

نے اسے اپنے پیٹ میں نگل لیا۔ ہم بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

کچھ دیر بعد وہ بولا ——— "چلو عجائب گھر چلیں"

میں نے کہا ——— "فائدہ"

کہنے لگا ——— "شاید وہاں ہمیں آنکھیں مل جائیں"

میں شانے اچکا کر اس کے ساتھ ہولیا۔

عجائب گھر میں ہم دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

سارے مجسمے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم نے بتی جلائی اور حیرت کی سسکی ایک ساتھ ہم دونوں کے لبوں سے ٹپکنے لگی۔ سارے مجسموں کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں اور ناکیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

سارے مجسمے رو رہے تھے،

کچھ دیر بعد جب ہم کیفے کی طرف جا رہے تھے تو اس نے میرے کندھے پر سر رکھتے ہوئے پوچھا "آج روشنیاں کہاں چلی گئی ہیں؟"

میں نے شیشوں میں سے باہر جھانکا۔ چاروں طرف اندھیرے کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور ہماری گاڑی اندھیرے کی قبر میں اترتی جا رہی تھی۔

لمحے بوجھل پتھر بن کر ہماری گردنوں سے لٹک رہے تھے،

اس نے میرے کندھوں کو جھنجھوڑا ——— "ہم کب پہنچیں گے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں ناچتے خوف کو سونگھا ——— "شاید کبھی نہیں"

اس نے تلملا کر میری طرف دیکھا

"ہاں شاید کبھی نہیں" ——— میری آواز میرے ہونٹوں کی بجائے دور کہیں سے آ رہی تھی۔ سارے شہر اندھیرے میں گم ہو گئے ہیں اور ہم جس لائن پر جا رہے ہیں اس پر کوئی اسٹیشن ہی نہیں"، ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، لیکن چپ رہے کہ ہمارے ناکردہ جرم کی تحریر ہمارے چہروں کی تختی پر نیون سائن کی طرح جل بجھ رہی تھی۔

یا ہو کی نئی تعبیر

اندھیرا آنکھیں ملتا ہوا رات کے بستر سے کہنیوں کے بل اُٹھ رہا ہے۔ اور اُجلا یا سویا سمٹی سی
دلہن کی طرح لمبا گھونگھٹ نکالے دبے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا ہے۔

پچھلی رات،

پچھلی ساری رات میں آنکھوں کی جھولی میں انتظار کے پھول لئے نیند کی نیلی چڑیا کی راہ تکتا
رہا ہوں۔ لیکن نیند کا جہاز میری پلکوں کی بندرگاہ میں لنگر انداز نہیں ہوا۔

ساری رات۔

پچھلی ساری رات ——— میں اپنی خواہشوں کے پنجرے سے اڑے ہوئے پرندوں کو پکڑنے
کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن سارے پرندے دھند میں لپٹی ہوئی زمین سے دور دور نکل گئے ہیں۔

کئی دنوں سے زمین کے چہرے میں چھپکلی اُگ آئی ہے اور اس کی چھاتیوں میں سرسراتے زرد رد میں
خواہشوں کے گندے انڈوں کی لیس دار جاگ نکل گئی ہے۔ ایک زنگ آلود کالی روشنی میرے جسم کی کڑھائی
میں وہ تبرک تل رہی ہے۔ جس کا بپتسمہ صدیوں پہلے میرے جسم نے مجھے دیا تھا۔

میں کھڑکی کھول دیتا ہوں۔

صبح نے اپنا ملجا گھونگھٹ اتار دیا ہے، اور اب دیواروں سے اتر کر گلیوں اور بازاروں میں دوڑ رہی ہے۔ میں اپنے بدن کی ریلنگ سے لٹکے سارے پردے ہٹا دیتا ہوں اور کلنڈر کے چکنے صفحوں پر چڑھ کر دنوں، مہینوں اور سالوں کے صفحے الٹنے لگتا ہوں۔ دھندلا غبار میرے چاروں طرف پھیل جاتا ہے اور کلنڈر کے خوشبودار صفحوں سے تاریخیں اڑ اڑ کر دور نیلاہٹوں کی جانب جانے لگتی ہیں میں ان کے ساتھ ساتھ دن، مہینوں اور سالوں کی گھمبیری وادیوں میں سے گزرتا دور ــــ بہت دور نکل آتا ہوں۔

یادیں اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھتی ہیں اور میرے وجود کے اجڑے کھنڈر میں چھن چھنا چھن ناچنے لگتی ہیں۔

"یاہو" ــــ اس نے نعرہ مار کر سامنے پڑے ہوئے شخص پر جست لگائی اور اسے پنجوں میں دبوچ کر اس کے نرخرے میں دانت گاڑ دیئے۔ تڑپنے والے نے خُر خُر کرتے ہوئے نرم زمین کو مٹھیوں کی ڈھلوانوں پر روکنے کی کوشش کی۔ لیکن زندگی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور گرم گرم نمکین خون کا ذائقہ اس کے دشمن کے لبوں پر دستکیں دینے لگا۔

وہ کچھ دیر اس کے نرخرے کے پیالے سے ہونٹوں کے خشک کھیت کو سیراب کرتا رہا۔ پھر اس نے اس کے جسم کو نوچنا شروع کر دیا اور نرم نرم تازہ گرم گوشت اتار کر کھانے لگا۔

"یاہو" ــــ سب ہنس رہے تھے اور آنکھوں میں للچاہٹ کی شمعیں جلائے گوشت سے اٹھتی بو کو اپنے نتھنوں میں باندھ رہے تھے۔

اس کا اشارہ پاتے ہی وہ سب زمین پر پڑے ہوئے جسم پر ٹوٹ پڑے۔ اور دیکھتے دیکھتے سارا جسم ہاتھوں کی کنڈیوں میں لٹکنے لگا۔ اس نے منہ سے لگے ہوئے خون کو کہنی سے صاف کیا اور لوگوں کو ایک طرف کرتا اس بڑی چٹان کی طرف بڑھا۔ جس کے ساتھ لگی وہ ہانپ رہی تھی۔

سارا جھگڑا اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ اس کے جسم کے گداز ابھاروں نے اسے اشارہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کی دوسری طرف اترنے لگا تھا۔ کہ اس شخص نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر اب وہ شخص کہاں تھا؟

اس نے مڑ کر دیکھا۔ زمین پر تو چند دھبے ہی تھے۔ وہ شخص تو بوٹی بوٹی ہو کر مختلف ہاتھوں

میں پہنچ چکا تھا۔

"یا ہو" ـــــ اس نے نعرہ لگایا اور سہمی ہوئی عورت کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کی طرف چلا گیا۔

"یا ہو ـــــ یا ہو"

میں اپنے جسم کے لمبے لمبے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور منہ سے نکلنے والی یا ہو کے پیچھے دوڑنے لگتا ہوں۔ فاصلوں کی گود میں بیٹھے ہوئے دیوتا مجھے پکارتے ہیں۔ میں ان کے قریب چلا جاتا ہوں۔ سالوں کی تیز درانتیاں میرے جسم پر اُگے ہوئے لمبے بالوں کی کالی فصلیں کاٹ رہی ہیں۔

مجھے نیند آ رہی ہے، میں اونگھ رہا ہوں،

سالوں کے جسموں سے رستی دھند مجھے لوریاں دینے لگتی ہے۔

پونتوخوس، تلوار میان میں ڈال کر باہر جانے لگا تو سارے غلاموں نے اسے دعاؤں کے ہاروں سے لاد دیا۔ ارنیا قریب ہی تھا۔ وہ ہوا میں دشمن کی بو سونگھتا پیدل ہی وہاں تک آیا۔ ارتیوس پہلے ہی آچکا تھا اور اب ارنیا کی پیاسی مٹی پر کھڑا اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بڑے وقار سے اس کے سامنے آیا۔ دونوں نے اپنی اپنی تلواروں کو دن کی سفید روشنی کی سلامی دی اور چند قدم ہٹ کر ایک دوسرے کی طرف دوڑے۔

پونتوخوس نے وار کرنے سے پہلے اپنے منہ میں دیوتاؤں کے مقدس نام کا شہد گھولا اور کہنے لگا۔
"اے اپالو! اگر تو میری مدد کرے تو میں تیرے مندر میں ایک موٹی تازہ جوان گائے کی قربانی دوں اور ایک دوسری گائے کی چربی سے تیرے مندر کی آگ تیز کر دوں"

اپالو اس کی تلوار کی نوک پر آ بیٹھا، ارتیوس اب صرف اپنا دفاع کر رہا تھا اور پونتوخوس کی تلوار کی نوک پر بیٹھا ہوا اپالو ارتیوس کے نرخرے کا بوسہ لینے کے لئے بے تاب ہوا جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے جب ارتیوس کے پاؤں لڑکھڑائے تو تلوار کی نوک پر بیٹھا ہوا اپالو اس کے نرخرے میں اتر گیا۔

گرم نمکین خون ارنیا کے پیاسے ہونٹوں کو گلابی بناتا چاروں طرف پھیل گیا۔

سب نے تالیاں بجا کر پونتوخوس کی بہادری کا گیت گایا۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے زمین پر پڑے ہوئے ارتیوس کو دیکھا اور بازار کی طرف چل پڑا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ لیکن پچھلے چند دنوں سے ارتیوس کی نیک نامی اور شہرت کے پرندے سارے شہر پر منڈلانے لگے تھے اور یہ بات اسے کسی قیمت پر قبول نہ تھی۔ اس نے بہت دنوں سے یہ سوچ رکھا تھا کہ اس اریِنا میں وہ ارتیوس کی زندگی کا قالین پلیٹ دے گا۔

اور اب وہ تلوار پر چپکتے ہوئے لہو کے قطروں کو اچھالتا ڈیانا کے بڑے معبد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

یورکلیا ڈیانا کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے مسکراہٹوں کے طشت میں اپنی خواہشوں کے دیئے جلا کر ایک دوسرے کو پیش کئے۔

پرنتوخوس نے جیب سے سکہ نکال کر مندر کی صندوقچی میں ڈالا اور یورکلیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے پچھلے حصے میں لے گیا۔

میں اپنے جسم پر نظر ڈالتا ہوں۔ میرے جسم کے کھیت میں اگی ہوئی بالوں کی فصل کٹ چکی ہے۔ دور سے آتی روشنیاں میرے جسم پر استری کر رہی ہیں۔ اور میرے بدن پر پڑی ہوئی سلوٹیں ایک ایک کر کے نکل رہی ہیں۔

نیند میری آنکھوں کے کٹوروں میں غنودگی گھول رہی ہے۔ میں لڑکھڑا کر سالوں کے پنگھوڑے میں گر پڑتا ہوں۔

ندی کا پانی گنگناتے ہوئے خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ بسنؔ دراس بھورے رنگ کی ایک چٹان سے ٹیک لگائے وینا بجا رہا تھا کہ امبا دبے پاؤں اس کے قریب آئی اور اپنی سریلی آواز کو وینا پر لپیٹتے ہوئے بولی ——

"ہے رام ——! تم ابھی تک یہیں ہو؟"

بسنؔ نے وینا ایک طرف رکھ دی اور بولا —— "کہاں جا رہی ہو؟"

کیسری رنگ کی ساڑھی اور جوڑے میں گیندے کا پھول سجائے وہ اسے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

امبا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا —— "شاکیہ منی کو دیکھنے نہیں جاؤ گے؟"

بسنؔ نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

بڑ کے درخت سے چھوٹا سورج آسمان کی وسعتوں میں چمک رہا تھا۔

وہ آلتی پالتی مارے بڑ کے نیچے بیٹھا تھا اور اپنی آواز کی طشتری میں سکون اور اطمینان کے ذائقے سجا کر سب کے کانوں میں ابدیت کا شہد ٹپکا رہا تھا۔

"دھرم کرو ——— دھرم کرو"

اس کی آواز بشن کے کانوں میں بیٹھے پرکھوں کی روایتوں کے جالے توڑنے لگی۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا ——— ہاں، اس نے اپنے شریر کو ریاضت کی آگ میں جلا کر اپنی آتما کو کندن بنا لیا تھا اور اب سراپا مسکراہٹ بنا بیٹھا تھا۔

اس کی آواز اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی ——— "کسی کو دکھ نہ دو۔ سب روحیں ایک سی ہیں۔"

ذات پات کے سارے رشتے تڑخ رہے تھے۔ ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔

وہ امبا کو وہیں چھوڑ کر چپ چاپ باہر نکل آیا

شام کو جب وہ امبا سے ملنے ندی کنارے جا رہا تھا تو دفعتاً کسی کا پاؤں اس کی گیروی دھوتی پر اپنا نشان ڈال گیا۔ اس نے مڑ کر غصے سے دیکھا۔ اروِنی سہما ہوا ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"تم" ——— اس کے اندر کا برہمن جست لگا کر باہر آ گیا۔

"تم نے مجھے بھرشٹ کر دیا۔"

اروِنی نے اپنی آنکھوں میں بے یقینی کے تھان کو لپیٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ———

"لیکن مہاراج وہ تو کہتا ہے کہ اب کوئی شودر نہیں، کوئی برہمن نہیں اور تم نے بھی تو اس کے سامنے اس کا اقرار کیا تھا۔"

بشن پرے ہٹتے ہوئے بڑبڑایا ——— "دفع ہو جاؤ ——— کتے!"

کچھ دیر بعد جب وہ ندی کنارے پہنچا تو امبا گھاس پر لیٹی ندی کی لہریں گن رہی تھی۔ اس نے پھول توڑا اور اس کے جوڑے میں سجانے لگا۔ امبا کے ہونٹوں پر مٹھاس کی بانسری بجنے لگی۔

بشن نے اسے اسی مسکراہٹ کی چادر میں لپیٹ لیا۔

بڑ کے نیچے آواز کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"دھرم کرو ، دھرم کرو ——— سنکھ بجاؤ ، سنکھ بجاؤ"

میرے جسم پر پھیلے ہوئے سیاہ دھبے پوتر لفظوں کے لیپ میں چھپ رہے ہیں۔ میں اونگھتے اونگھتے
مسکراتا ہوں ——————— زمانے کے پنگھوڑے میں لیٹے لیٹے سالوں
اور صدیوں کی چوٹی چوٹی چڑھتے چڑھتے کئی خواب میری پلکوں کی چلمن پر دستک دیتے ہیں۔
دریا کی پھیلی باہنوں کو دیکھ کر قافلہ رُک گیا۔
شمعون نے راحیل کے کان میں سرگوشی کی ——— "اب کیا ہوگا"
راحیل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور دریا کی طرف دیکھنے لگی
دریا درمیان سے پھٹ چکا تھا۔
اور سارے دوڑتے ہوئے اسے پار کر رہے تھے۔ راحیل نے شمعون کا ہاتھ پکڑا اور دریا کی
گود میں اتر پڑی۔ شمعون نے دوسرے کنارے کی طرف جاتے ہوئے بڑی عقیدت اور احترام سے اسے
دیکھا جو سب سے آگے عصا ہاتھ میں لئے چلا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ———
"اب سب ایک دوسرے کی باہنیں ہیں"
دوسرے کنارے پر پہنچ کر سب نئی وادیوں میں اتر گئے۔ یونتن پیچھے رہ گیا تھا اس نے اسے آواز دی
جب یونتن رک گیا تو وہ بڑے سکون سے اس کے قریب آیا اور پھر اچانک اس نے یونتن کو نیچے گرا لیا
یونتن کے ساتھ اس کا خاندانی جھگڑا برسوں سے آج کے دن کا انتظار کرتا چلا آ رہا تھا اور آج اس
نے یونتن کے گرم ابلتے نمکین خون کی سرخی کو دن کی روشنی دکھا کر اس کا فیصلہ کر دیا اور عصا ہاتھ
میں لئے وہ کہہ رہا تھا۔

"اب سارے ایک دوسرے کی باہنیں ہیں"
میں لڑکھڑا کر اگلے خواب کی اطلسی وادی میں جا گرتا ہوں۔
لمبے چوغے والے نے کتاب بند کر دی اور بولا ——— "تو یوں ہے کہ جو دوسروں کی غلطی معاف
کرے وہ مقدس باپ کی نظروں میں اتر گیا۔ اور یوں سمجھو کہ اسے سب کچھ مل گیا"
اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ملائم سکون محسوس کیا اور بڑی عقیدت سے الٹے پاؤں باہر آگیا
جب وہ گھر پہنچا تو رتھ سو چکی تھی اور اس کا غلام پرونیس حسب معمول جاگ رہا تھا۔ جونہی وہ اپنا

کوٹ اتارنے لگا۔ پروینس نے اس کے کان میں سرگوشی کی ——— "مالک امی جیرس آج پھر مالکن کے پیچھے پیچھے باغ میں گیا تھا۔"

یہ بات سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور دوڑتا ہوا اسلحہ خانہ میں آیا۔ تلوار نکال کر اس نے اس کی دھار کو جانچا اور اسی رفتار سے خواب گاہ میں آیا۔ رتھ مسکراہٹوں کی بگھی میں بیٹھی رنگین خوابوں کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

"کتیا" وہ لفظوں کو دانتوں کے آرے میں کترتے ہوئے بڑبڑایا اور تلوار لہراتا امی جیرس کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

میں چونک کر اسے دوڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ لیکن وہ فاصلوں کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔ دن، صدیاں ایک دوسرے کی باہیں پکڑے میرے ساتھ لکن میٹی کھیل رہے ہیں۔

وہ دوسرے کمرے سے تلوار لے آئی اور ادریس کو دیتے ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ادریس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں سمیٹ لیا اور بولا ———

"بیگمی ہم صبح ہونے سے پہلے لوٹ آئیں گے اور پھر"

اس نے اس کے ہونٹوں کی گلابی قبر پر مخملی خواہشوں کے پھول چڑھائے۔

عائشہ نے اس کا بازو پکڑ لیا "نہ جاؤ"

ادریس نے جھٹک کر اسے پرے کیا۔ اور بولا ——— "تم چاہتی ہو سارا قبیلہ مجھے بزدل کہے۔"

عائشہ نے پھر اس کا بازو تھام لیا ——— "لیکن شب خون مارنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

ادریس نے غصے سے اسے گھورا "یہ کیا کم وجہ ہے کہ وہ ہمارے کنوؤں کے پانیوں میں حصہ مانگتے ہیں"

وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ آذان کی آواز ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر فضا میں دوڑنے لگی۔

ادریس نے نرمی سے ہاتھ چھڑا لیا اور عائشہ کو ایک طرف کرتے ہوئے بولا ——— "خدا حافظ، ہم فجر کی نماز واپس آکر پڑھیں گے، انشاءاللہ"

تلواروں سے ٹپکتا گرم گرم لہو میری پلکوں پر گرتا ہے۔ میں جلدی سے آنکھیں کھولتا ہوں۔ سبز مخملی روشنی دھندلائی ہوئی ہے اور میری خواہش کا اندھا رتھ سارے زمین کو روندے چلا جا رہا ہے۔

لی یونگ چی نے سُرخ کتاب بند کر کے گھٹنوں پر رکھ لی اور دور پھیلے فاصلوں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس کتاب کے لفظوں کی کوکھ سے پھوٹنے والی روشنی نے تو اسے مانجھ دیا ہے۔

اس کا انگ انگ لشکنے لگا ہے۔

اس نے فاصلوں کی دھند میں سے چانگ پو کے قدموں کی آہٹ کو سُننا چاہا۔ جو صبح سے شہر گئی ہوئی تھی اور اپنے ساتھ خبروں کی تازہ فصل لانے کا وعدہ کر گئی تھی۔ آج ان کی چھٹی کا دن تھا اور چانگ پو کمیون کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ صبح سویرے شہر چلی گئی تھی۔

اس نے کتاب کھولی۔

اس کتاب نے اس کی زندگی کے سارے رُخ ہی بدل دیئے تھے وہ ساتھیوں کے ساتھ کورس گاتا۔ قدم بہ قدم، شانہ بہ شانہ آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ایک سکون، ایک اطمینان

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا

شام کو چانگ پو اور دوسرے ساتھی واپس آئے تو ان کندھوں سے زرد کیڑے چمٹے ہوئے تھے

کچھ لوگ خیمے کو ٹڈیوں کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ ہمیں ان کا محاسبہ کرنا ہے۔

اس کے ہاتھوں کی گرفت بندوق پر مضبوط ہو گئی۔

زرد بخار کے جراثیم چاروں طرف پھیل گئے۔ سب ایک دوسرے کو شبہ کی کلہاڑیوں اور شک کی درانتیوں سے کاٹ رہے تھے۔

خون —— گرم، ابلتا، نمکین خون،

میں اپنے ہونٹ چوستا ہوں

حیرت کے احرام میں لپٹی میری آنکھیں سارے جسم کا طواف کرتی ہیں

میرے جسم پر ملائم شفاف چکناہٹ گنگنا رہی ہے۔

میں اپنی آنکھوں کو منہ کے راستے اندر اتار دیتا ہوں۔

اندر بڑی بڑی خوفناک چہروں والی سیاہ نوکیلی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔

میری آنکھیں زخمی ہو جاتی ہیں

ان پر سیاہی جمنے لگتی ہے
باہر سے میں کتنا ملائم اور شفاف ہوں
لیکن اندر سے ——— !
"یاہو ——— " میرے منہ سے نکلے ہوئے خوب صورت، ملائم اور
لذیذ لفظ سامنے والے کے نرخرے میں گڑ جاتے ہیں۔ میں ہونٹوں کی طشتری میں
گرم، ابلتے، نمکین لہو کا ذائقہ چکھتا ہوں
"یاہو ——— یاہو"
میرے اندر اُگے ہوئے لمبے سیاہ بالوں کے جنگلوں میں کوئی سرسراتا ہے اور چپکے چپکے
ہنستا ہے ؟

تشبیہوں سے باہر ایک پھڑپھڑاہٹ

جب ریل کار سٹیشن کی گرد میں سے پھسل کر اندھے فاصلوں کی چپیلی بانہوں میں داخل ہوئی تو اسکے پیچھے لانبی لانبی بھوکی زبانیں نکالے پٹڑی کے شفاف جسم کو چاٹ رہے تھے۔ لیکن جب انہوں نے شہر کا آخری پل عبور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ ریل کے پہیے دھیرے دھیرے پٹڑی سے علیحدہ ہو رہے ہیں اور ڈبہ ہوا میں تیر رہا ہے۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پہیوں کی طرف دیکھا —— پٹڑی دور نیچے تیر رہی تھی، اس نے گھبرا کر سر اندر کر لیا اور دائیں ہاتھ والے سے کہا —— "ہم تو ہوا میں سفر کر رہے ہیں۔" دائیں ہاتھ والے نے اخبار سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے دوبارہ اخبار پڑھنے لگا۔ وہ دو ایک لمحے اس انتظار میں رہا کہ وہ جواب دے گا۔ لیکن جب اس نے اخبار سے سر نہ اٹھایا تو اس نے بائیں ہاتھ والے سے کہا —— "بھائی زمین سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔"

بائیں ہاتھ والے نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا —— "تو پھر کیا ہے"
اس نے گھبرا کر کھڑکی سے سر باہر نکالا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ ریل کار ہوا میں اڑ رہی تھی۔

"اَب کیا ہوگا" —— اس نے سوچا —— "میں گھر کیسے پہنچوں گا؟"
"گھر —— کون سے گھر" سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے تمسخر سے کہا
"میرے اپنے گھر" اس نے جلدی سے کہا۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کیا اس کا کوئی اپنا گھر ہے؟
گھر — گھر — گھر ریل کار کی آواز اس کے کانوں میں سیٹیاں بجانے لگی۔ تو دائیں طرف والا اور بائیں طرف والا، دونوں ہی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں اور یہ سامنے والا پوچھتا ہے کہ میرا گھر کونسا ہے؟
تو —— تو پھر
اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا
وہ بھی تو سامنے والی نشست پر ہی بیٹھی ہوئی تھی اور بڑی دیر سے اس کی آنکھوں میں توجہ کے سائبان تنے ہوئے تھے۔
تو یہ میری بات سمجھ رہی ہے۔
وہ اچک کر کھڑکی میں جھانکنے لگا اور جب اپنی سیٹ کی طرف مڑا تو اس نے سرگوشی میں اس سے کہا —— "ہم ہوا میں سفر کر رہے ہیں"
اس نے اپنی تائید مسکراہٹ کی مخملی پٹی میں لپیٹ کر اس کی طرف پھینکی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور تجسس کے ننھے منّے ہاتھوں سے اس کے سراپا کو ٹٹولنے لگا۔
جنگل کے ہرن سینگ میں سینگ پھنسائے اسکے سینے پر کلیلیں کر رہے تھے اور وہ بار بار پلکوں کی بالکونی سے جھانک جھانک کر اس پر شناسائی کے مسکراتے کنکر پھینک رہی تھی۔
اس نے سوچا فرض کر و میں اس کا نام "ی" رکھ لیتا ہوں۔
تو "ی" مسکراہٹوں کے چپوؤں سے اس کے دل کی کشتی کو کھیتے ہوئے گہرے پانیوں میں لئے چلی جا رہی ہے۔
دفعتہً اسے خیال آیا، اس کا نام "ی" ہی کیوں؟ آخر اس سے پہلے بھی تو بے شمار حرف ہیں، ان میں سے کوئی کیوں نہیں؟

تو پھر کیا —— کیوں نہ "ا" سے شروع کروں؟

تو اس نے "ا" سے شروع کیا،

لیکن "ا" تو مدت ہوئی بوڑھا ہو چکا ہے،

"ب" ویسے ہی بیمار ہے اور بستر پر لیٹا ہوا ہے۔

"ج" کا آدھا حصہ ٹوٹا ہوا ہے

اس نے ایک ایک حرف کو اس کے گنگناتے بدن پر چسپاں کرنے کی کوشش کی، مگر سارے حروف بیمار اور کھوکھلے تھے۔

اب کیا کروں؟

ہمارے تو حروف سبھی ہی بیمار ہیں

تو پھر "ی" ہی ٹھیک ہے،

ہاں تو یہ "ی" اس کے ساتھ ہی سٹیشن سے سوار ہوئی تھی کچھ دیر نشستوں کی (ADJUST MENT) آس پاس کے چہروں کی گنتی اور پھر دھیرے دھیرے دوسرے چہرے اس کی دلچسپی کی تسبیح سے ایک کر کے کھسکتے چلے گئے اور لڑی میں بس "ی" کا ایک چہرہ رہ گیا، جسے اپنی آنکھوں کی پوروں سے اس نے اتنا چکنا کر لیا ہے کہ اب اس کی پلکیں اٹھتے ہی وہ پھسل کر اس کے دل کے آنگن میں آگرتا ہے۔

تو یہ "ی" ہے،

اور میں —— میں کون ہوں؟

اسے خیال آیا، اسے اپنے لئے بھی کوئی حرف منتخب کر لینا چاہیئے۔

لیکن "ا" سے "ی" تک سارے حروف تو بخار میں مبتلا ہیں،

تو پھر وہ میں ہی ہے،

تو میں فی الحال میں ہی ہوں،

ہاں تو اس میں کو کہاں جانا ہے؟

انہیں تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا اتنے برسوں میں ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں جان سکا تھا کہ برانچ لائن کونسی ہے اور مین لائن کونسی، ویسے کرنے کو مسلسل سفر کر رہے تھے۔

"لیکن کیا ہم واقعی سفر کر رہے ہیں یا اتنے برسوں سے پلیٹ فارم پر ہی کھڑے ہوئے ہیں۔"
اس نے دائیں ہاتھ والے سے پوچھا۔ دائیں ہاتھ والے نے اخبار سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا
اور پھر جھک کر اس کے کان میں بولا۔ "میاں تم پلیٹ فارم کی بات کرتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے
ہم ابھی تک اپنی ماں کے پیٹ ہی سے باہر نہیں نکلے۔"
تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے،
اور مڑ کر "ی" کو دیکھنے لگا۔

"ی" بہت خوب صورت تو نہیں تھی، لیکن اس کے گنگناتے بدن کے کچے آنسوں میں جوانی کے بہت
سے بچے کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کر رہے تھے۔

تو کیا ہم سب جنم لے چکے ہیں؟" —— اس نے بائیں ہاتھ والے سے پوچھا،
بائیں ہاتھ والے نے کتاب سے سر اٹھایا اس کی طرف دیکھا اور بولا —————— "یار تم
سوال بہت کرتے ہو، ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

اس نے کہا —— "بھائی میں کہہ رہا تھا کہ کیا ہم سفر کر رہے ہیں، لیکن ٹھہرو پہلے میں
تمہارا نام رکھ لوں۔"

بائیں ہاتھ والا اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا، پھر بولا —— "یہی تو المیہ ہے کہ میرا کوئی نام
نہیں۔ ہم دوسروں کے ناموں کو اپنا سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں ہمارا کوئی نام نہیں۔ جب تک
ہم ایک نام کے حروف تلاش نہیں کرتے اسی پلیٹ فارم پر ہی بیٹھے رہیں گے۔"

"تو کیا ہم پلیٹ فارم پر ہی ہیں۔" اس نے گھبرا کر سوال کیا اور اچک کر کھڑکی میں جھانکنے لگا۔
"میاں ہم تو پچھلے کئی سو سالوں سے اسی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔" بائیں ہاتھ والے نے آنسو
پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ دھڑام سے اپنی سیٹ پر گر گیا
تو میں کیا کروں؟
کیا میرے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ میں بھی اپنے سے پہلوں کی طرح اسی پلیٹ فارم پر
مر جاؤں؟

اس نے رحم طلب نظروں سے "ی" کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولا "اے اچھی لڑکی کیا تو میری کوئی مدد کر سکتی ہے ؟"

"ی" نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسی سرگوشی میں پوچھا ـــ "کیسے ؟"

"اس طرح کہ میرے پیدا ہونے میں میری مدد کرو"

"ی" کھلکھلا کر ہنس پڑی

پھر وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا

دور دور تک پھیلے کھیتوں میں کام کرتے کسان سیدھے ہو رہے تھے اور اپنی درانتیاں اوپر اٹھا رہے تھے ۔

یہ سب کمزور ہیں انہیں دودھ کی ضرورت ہے

لیکن کون سے دودھ کی

تو دراصل یہ گاڑی چل نہیں رہی بلکہ ایک ہی جگہ کھڑی ہے ۔

تو پھر کیا کروں

اس نے دائیں بائیں بیٹھے دونوں شخصوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور بولا ـــــ "آؤ نیچے اتر کر دیکھیں گاڑی چل کیوں نہیں رہی ہے ؟"

دونوں نے بیک وقت حیرت اور استعجاب سے اس کی طرف دیکھا اور پھر غصے سے بولے ـــ "یہ ہمارا مسئلہ نہیں"

"تو پھر کس کا ہے ؟" اس نے خود پوچھا

یہ ان دونوں کا مسئلہ نہیں

یہ "ی" کا بھی مسئلہ نہیں

تو پھر یہ مسئلہ کس کا ہے ؟

"ی" نے اب اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا اور اس دوران وقفوں وقفوں سے پلکوں کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیتی تھی ۔

وہ بھول گیا کہ گاڑی چل نہیں رہی ،

اس کے دل کے گملے میں اب ننھے منے پودے سر اٹھانے لگے تھے اور "ی" کے بدن سے نکلتی خوشبوؤں کی ننھی منی کنکریاں اس کے نتھنوں کے صحن میں آکر گر رہی تھیں۔

تو اصل میں ہم سفر نہیں کر رہے

ایک لمحے کے لئے اسے پھر خیال آیا

لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے آس پاس سارے مطمئن بیٹھے ہیں تو اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو پرے پھینک دیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر سیٹ میں گھس گیا۔

باہر اب تاریکی کی پھوار پڑنے لگی تھی

"ی" نے جھک کر سیٹ کے نیچے سے اپنی ٹوکری نکالی اور اس میں سے لفافہ نکال کر اسے کھولنے لگی۔ لفافہ کھولتے ہوئے وہ مسلسل کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر لفافہ میں سے اس نے کیک کا ٹکڑا نکالا اور اسے ہاتھ میں لے کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے ایک دم ڈھیر ساری بھوک کا احساس ہؤا

"میں تو صدیوں سے بھوکا ہوں" اس نے سوچا —— "تو "ی" یہ ٹکڑا مجھے دے گی۔

وہ سراپا انتظار اور سوال بن کر "ی" کے سامنے پھیل گیا۔

"ی" ایک یا دو لمحے تذبذب کی پینگ پر جھولتی رہی۔ پھر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لے کر کیک کے ٹکڑے کو منہ میں رکھ لیا اور لفافے میں سے ٹکڑے نکال نکال کر کھانے لگی۔

تو اصل میں "ی" بھی اندر سے ایک کھوکھلا حرف ہے۔

ہم کر بھی کیا

ہمارے تو سارے حروفِ تہجی ہی اندر سے کھوکھلے اور بیمار ہیں

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے" —— اس نے چیخ کر کہا

سارے اس کی طرف متوجہ ہو گئے

"کیا بات ہے؟" —— دائیں ہاتھ والے نے برہمی سے پوچھا

ہمیں جو کچھ ورثہ میں دیا گیا ہے وہ سب کا سب کھوکھلا اور بیمار ہے اور یہ سارے حروفِ تہجی متعدی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔

"ی" نے کیک کھا کر لفافے سے انگلیاں صاف کیں۔ اور لفافے کو کھڑکی میں سے باہر پھینک دیا
اس نے دیکھا
کھیتوں میں کام کرتے کسان درانتیاں لئے ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہے تھے۔
"ی" نے مجھے کیک کا ٹکڑا کیوں نہیں دیا؟
اس کے اندر دکھ اور غم کی ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنا اٹیچی لے کر نیچے اترا تو پلیٹ فارم پر اس کا دوست اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔
اس کے دوست نے لپک کر اسے کندھے سے پکڑ لیا اور بولا —— "عجیب آدمی ہو میں تمہیں لینے آیا ہوں اور تم مجھے دیکھ کر بھی دوسری طرف چلے جا رہے ہو۔"
اس نے جھٹکے سے کندھا چھڑا لیا اور بولا —— "میں نے تو سفر ہی نہیں کیا۔ تم مجھے کیوں لینے آئے ہو؟"

پھر یہ دیکھ کر کہ اس کا دوست حیرت سے اسے تکے جا رہا ہے وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا —— "ہم سب تو اسی پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ ہم اس کے ایک دروازے سے باہر جاتے ہیں اور دوسرے سے پھر اندر آ جاتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سفر کر رہے ہیں۔"
پھر کچھ دیر بعد بولا —— "دراصل ہمارے حروفِ تہجی ہی بیمار ہیں۔ جب تک ہم نئے حروفِ تہجی نہیں بنائیں گے اسی ناسفری کے آشوب میں گھلتے رہیں گے۔"
دور کھیتوں میں جمع ہوتے کسانوں کی آوازیں اب اس کے جسم کے دروازوں پر دستکیں دے رہی ہیں۔
اس نے اپنا اٹیچی گھما کر لائنوں پر پھینک دیا اور بولا —— "لعنت ہے مجھ پر میں اتنا عرصہ ایک بے معنی اور بے مقصد بوجھ اٹھائے پھرتا رہا ہوں۔"
"ی" نے اب خوشبو کا نقاب اتار پھینکا تھا —— ہاتھوں میں کیک کا ٹکڑا لئے رس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ باہر نکل آیا۔

تیز دھوپ میں مسلسل رقص

اُوپر تیز بخار میں جلتا ہوا سورج
نیچے بھول بھلیاں، راستہ بھٹکی سانسوں کے آبشار
لذت سے ہمکنار، لذت سے محروم فاصلے
پھیلے ہوئے سمٹے ہوئے فاصلے
جستجو کے پھڑپھڑاتے ہوتے پروں سے چپٹے ہوئے ہاتھ، خواہشوں کے لیسلے پیڑ پر اُگے ہوئے ہاتھ، خالی اور بھر کر ہوتے ہاتھوں کے درمیان تیزی سے گھومتی ہوئی رسی پر اچھل اچھل کر کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانے کی کوشش میں الجھا ہوا وہ سر گھما کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔
تیز دھوپ سے بچنے کی صورت
آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ
وہ صفحہ الٹ کر لفظوں کو چوسنے لگتا ہے۔
اندھیرے کی بانسری پر جھومتا ہوا سورج جب رینگ رینگ کر مشرقی منڈیر سے سر نکالتا ہے تو میونسپلٹی کی لاری اس کے مٹیالے منہ پر چھینٹیں مار مار کر اسے جگاتی ہے۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے

اٹھ بیٹھتی ہے - اس کی پسلیوں میں سے چھوٹی گلیوں کی نیم تاریکیوں سے لوگ ایک ایک کرکے باھر نکلتے ہیں اور اس کی چھاتیوں کو گدگداتے بڑے چوک میں گم ہو جاتے ہیں - اس کے دائیں طرف ایک لمبی خاموش دیوار ہے جو اس کی انگلیوں کی پوروں تک پھیلی ہوئی ہے ۔ یہ دیوار مدتوں سے یوں ہی سکتے کے عالم میں ہے ۔ بائیں طرف ایک دو —— تین چار نیم تاریک گلیاں ہیں ۔ جو سارا دن ابکائیاں لیکر لوگوں کو اس کی جھولی میں اگلتی رہتی ہیں ۔ سر کی طرف بتی والا بڑا چوک ہے ۔ جس کے جبڑے صبح ہوتے ہی پھیل جاتے ہیں اور وہ نتھنے پھلا پھلا کر سارا دن بڑی چھوٹی گاڑیاں، ٹانگے، سائیکل اور پیدل چلنے والے لوگوں کو اس کے منہ پر تھوکتا رہتا ہے ۔ پاؤں کی طرف دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک موڑ ہے ۔ جہاں پہنچتے پہنچتے اس کی شکل دھندلی ہوتی جاتی ہے ۔

ٹریفک کی زنجیر سارا دن اس کے سینے پر کروٹیں لیتی رہتی ہے اور وہ اس کے نیچے دبی کبھی لمبے لمبے سانس لے کر اور کبھی رینگ رینگ کر اس بوجھ کو دائیں بائیں کرتی رہتی ہے ۔ شام کی پھوار پڑتے ہی جب ٹریفک کی بھاری زنجیر ٹوٹتی ہے وہ منہ میں تھکن کی چوسنی لئے اپنے دونوں کناروں میں سمٹ کر اونگھنے لگتی ہے ۔ صبح سویرے جب سورج رات کے بند دروازوں پر دستک دے رہا ہوتا ہے، میونسپلٹی کی لاری بڑے چوک کے حاملہ پیٹ میں سے سر نکالتی ہے اور اس کے مٹیالے چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارتی موڑ کی اندھی گلی میں گم ہو جاتی ہے ؛

معمول کے ٹھیکے ٹھکائے یک رنگ چوکھٹے میں پھنسا ہوا دن

طلوع اور غروب کے یکساں سانچے وہ گہرے رنگ کا چشمہ لگا کر اگلا صفحہ پلٹتا ہے ۔

تیز بخار میں ہذیانی رقص کرتا سورج، اس کے عین سر پہ آ کھڑا ہوتا ہے

وہ جلدی سے صفحہ الٹتا ہے ۔

لیکن اسی صبح جب پانی کے چھینٹوں کے انتظار میں کسمساتے اسے بہت دیر ہو گئی تو ——
اس نے اپنے کناروں سے سر نکال کر بڑے چوک کی طرف دیکھا - میونسپلٹی کی لاری بتی والے کھمبے سے لگی سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی ۔ پتھروں کا اونچا ڈھیر دونوں ہاتھ پھیلائے اسے روکے ہوئے تھا ۔

وہ سر گھما کر دیکھتی ہے۔ پتھروں کے یہ پھوڑے اس کے سارے جسم پر پھیلے ہوئے ہیں اور درد اس کی پور پور میں رینگ رہا ہے۔

یہ رات ۔ اذیت کی یہ رات

وہ آہ بھر کر انگڑائی لیتی ہے اور اس کی نظریں اس پر پڑتی ہیں، وہ اپنے ڈگمگاتے قدموں پر جسم کا سارا بوجھ ڈالے اس کے کنارے کنارے چلا آرہا ہے۔ وہ ادھ کھلی نیم خواب آنکھوں سے اسے دیکھتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے اس کے پاس بیٹھ جائے، وہ اچک کر اس کے پاؤں پکڑنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی پتھروں کے ایک ڈھیر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ پتھروں کے نیچے ہی نیچے سرک سرک کر اس کے قریب آتی ہے اور ڈھیر کی درزوں میں سے سر نکال نکال کر اس کے ساتھ آلگتی ہے۔

"تو یہ شخص وہی ہے"

وہ دھیرے سے اس کے پاؤں میں چٹکی لیتی ہے لیکن وہ اسی طرح گم سم دور خلا میں کسی نامعلوم شے کو گھورتا رہتا ہے

"تو یہ وہی شخص ہے"

یہ شخص ہر صبح سات بجے گلی نمبر ۸ سے نکل کر بڑے چوک میں جاتا ہے۔ چار بجے انیس نمبر بس اسے دوبارہ چوک کی جھولی میں اگل جاتی ہے اور وہ اسی طرح خاموشی سے گلی نمبر ۸ میں لوٹ جاتا ہے۔ شام کو وہ ایک عورت اور بچے کے ساتھ باہر آتا ہے۔ عورت کھنکھناتا جسم متجسس آنکھیں۔ خواہشوں کے لیسلے پیڑ پر اُگے کانٹوں میں پھنسے زخمی ہاتھ۔

بچہ معصومی کی رنگین پینگ پر ہلارے کھاتا، دھنک رنگوں کو پکڑنے کی کوشش میں مگن!

واپسی پر گلی میں داخل ہونے کی ترتیب —— سب سے پہلے خواہشوں کے ہاتھوں رہن رکھی آنکھوں والی عورت پھر جمائیاں لیتا بچہ اور آخر میں وہ جو ہے بھی اور نہیں بھی

وہ پتھروں کی درزوں میں سے سر نکال کر اسے غور سے دیکھتی رہتی ہے۔ یہ شخص پچھلے کئی سالوں سے اسی طرح زندگی کو وقت کو چرخی پر لپیٹ رہا ہے، صبح شام، صبح شام، پھر وہی رات اور اس کے بعد وہی صبح و شام، صبح و شام۔ عورت اس سے قدرے مختلف ہے۔ اس کی آنکھوں کے طاقچے میں ہر روز نئے

نئی شمعیں جھلملاتی ہیں ۔ وہ کئی بار عورت کے پاؤں کے نیچے سرکتی سرکتی گلی نمبر چار کے نیم تاریک دہانے تک آئی ہے ۔ اس کا کئی بار جی بھی چاہا ہے کہ عورت کے ساتھ اندر جائے ۔ لیکن دونوں کناروں کے اندر بندھے اس کے پاؤں راستہ روک لیتے ہیں ۔ عورت جب بھی گلی سے نکلتی ہے وہ چوکنی ہو جاتی ہے اور دوڑ کر اس کے قریب آ جاتی ہے ۔ جب عورت پہلی بار دن کے وقت اکیلی باہر آئی تھی تو وہ اس کے ساتھ ساتھ سبزی والے کی دکان تک گئی تھی ۔ کچھ دنوں تک عورت کا یہ سفر گلی سے سبزی والے اور سبزی والے سے گلی تک ہی محدود رہا ۔ پھر وہ دکان نمبر سات تک آنے لگی ۔ یہ ایک چھوٹا سا جنرل سٹور ہے ۔ شروع شروع میں عورت جنرل سٹور کے شوکیس کے پاس کھڑے ہو کر سودا خریدتی ہے ۔ پھر رفتہ رفتہ وہ آگے اور آگے ، سٹور کے پچھلے حصہ میں جانے لگتی ہے ۔

یہ شخص تو چار بجے واپس آتا ہے ۔ جب عورت سٹور کے پچھلے حصہ کی سیر کر کے اور اپنی ٹوکری بھر کر گلی میں واپس جا چکی ہوتی ہے ۔ وہ جلدی سے جلدی گلی میں داخل ہوتا ہے ۔ شام کو وہی ترتیب پہلے عورت پھر بچہ اور آخر میں وہ کنارے کنارے بڑے چوک تک ، واپسی اسی طرح ، پہلے عورت پھر بچہ اور آخر میں وہ ، اور اب یہ وہ پتھروں کے اس ڈھیر سے ٹیک لگائے کسی نامعلوم خوف کے بوجھ میں پھڑپھڑا رہا ہے ۔

وہ اچھل کر اس کے چہرے پر لکھے لفظ پڑھنے کی کوشش کرتی ہے ۔ سارے لفظ بے ترتیب بے ڈھنگے لائنیں ٹیڑھی اور مٹی مٹی اس کی آنکھوں میں کل رات کا منظر منجمد ہو جاتا ہے ۔

ایک کار گلی نمبر چار کے قریب آ رکتی ہے ۔ گلی سے پہلے عورت اور اس کے پیچھے بچے کو گود میں لئے وہ باہر آتا ہے ۔ عورت جلدی سے کار میں بیٹھ جاتی ہے —— وہ بچے کو گود میں لئے گم سم اسے دیکھتا رہتا ہے ۔ کار تیزی سے مڑتی ہے ۔ بچہ لپک کر عورت کو پکارتا ہے ۔ لیکن کار بڑے چوک کی گود میں گم ہو جاتی ہے ۔ وہ جلدی سے گلی میں کو د جاتا ہے ۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹرک نمودار ہوتا ہے اور پتھروں کا ایک ڈھیر اس کے سینے پر پھینک کر چوک کی طرف بھاگ نکلتا ہے ۔ پھر رات گئے تک پتھروں کے ڈھیر اس کے سارے جسم پر پھیل جاتے ہیں :

وہ صفحہ پلٹنے سے پہلے گہرے رنگ کا چشمہ اتار دیتا ہے اور سر اٹھا کر تیز بخار میں جلتے ، ہذیان بکتے سورج کو دیکھتا ہے ، سورج اپنی ہتھیلیوں پر الاؤ جلائے پورے آسمان پر ناچ رہا ہے ۔

تھتھا تھیا تھیا ـــــ تھتھیا تھیا تھیا

گلی نمبر تین کی مسجد میں نماز ختم ہو گئی ہے اور اکا دکا نمازی گلی سے نکل رہے ہیں۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھتا ہے اور پتھروں کے ڈھیر کے پاس کھڑا بے چینی سے بڑے چوک کی طرف دیکھنے لگتا ہے

وہ پتھروں کے ڈھیروں کے پیچھے سرکتی سرکتی بڑے بڑے چوک کے قریب آتی ہے۔ کار چوک کے دوسرے سرے سے نکلتی ہے۔ پتھروں کے ڈھیر دیکھ کر چوک ہی میں رک جاتی ہے۔ عورت باہر نکلتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی ہے۔ دونوں چپ چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ گلی نمبر چار کی تاریکی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک خوفناک چہرے والا انجن بڑے چوک طرف سے آتا ہے۔ اس کے پیچھے بیلچوں اور گینتیوں کی قطار ہے۔ انجن پھک پھک کرتا اس کے سینے پر آ چڑھتا ہے۔ بیلچے اور گینتیاں بھوکے گدھوں کی طرح اس کی لاش پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

وہ پھر گہرے رنگ کی عینک اپنے منہ پر چڑھا لیتا ہے۔ ہاتھوں میں حدت اور چبھن کے برچھے لئے ہذیانی سورج اس کے عین سر پر ناچ رہا ہے۔ رفتار۔ بوجھ اور دکھ کا رقصِ مسلسل۔

وہ سر گھما گھما کر ایک ایک کو دیکھتا ہے۔ پھر کتاب کو زور سے دیوار پر دے مارتا ہے۔ کتاب کے مضمون پر ٹنگے حرف ٹوٹ ٹوٹ کر تڑخ تڑخ کر نیچے گرتے ہیں۔

سوکھے ہوئے لفظ ــــ تڑخے ہوئے لفظ

چرسے ہوئے لفظ ــــ بھوکے لفظ

تیز دھوپ سے بچنے کی صورت

آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ

لیکن بدن پر رینگتی دھوپ، جسم تو اسی طرح جل رہا ہے!

جاگتی آنکھوں کا خواب

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس میز پر پڑے ہوئے اسے ایک لمحہ گزرا ہے، ایک سال یا ایک صدی وہ تو بس لیٹا ہوا چھت کو اپنی آنکھوں میں پرو رہا تھا اور تنہائی کا ہانپتا کتا، زبان باہر لٹکائے اس کے سارے جسم کو چاٹ رہا تھا۔ سورج نیچے اتر کر اس کے سر پہ آ بیٹھا تھا اور اس نے اپنی ٹانگیں اس کے سینے پر پھیلا دی تھیں۔ اس لئے اسے احساس نہیں تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے۔ کیونکہ ساری چیزیں یا تو سو رہی تھیں یا اسی کی طرح وقت کی ٹوٹی ہوئی رسیوں سے لٹک رہی تھیں۔

ایک لمحہ — ایک سال — یا ایک صدی، جانے کب سے وہ اسی طرح تنہائی کی کھڈی پر سانسوں کی اون سے اپنی زندگی کا قالین بن رہا تھا۔ اب یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ قالین تھا۔ کہ دری، کیونکہ وہ جب بھی اس پر ہاتھ پھیرتا کھردرا پن اس کی پوروں پر رینگنے لگتا اور وہ جھنجھلا کر دوبارہ میز پہ آ گرتا۔ اسے آپریشن کے لئے اس کمرے میں لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کا ایک گردہ خراب ہو گیا ہے۔ اس کے بدن کے کھلیان میں گندے خون کی قلم لگ گئی ہے۔ ہاں اسے یاد آیا، اسے گردے کے آپریشن کے لئے یہاں لایا گیا تھا، لیکن کب۔ ایک لمحہ — ایک سال

یا ایک صدی پہلے، جانے کب اسے یہاں لایا گیا تھا شاید وہ پیدا ہی اسی میز پر ہوا ہو۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر میز کو چھونا چاہا۔ لیکن اس کے بازو میں درد کی گیند پھٹنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر نے اس کے بازو میں انجکشن لگایا تھا۔ دوا سوئی کی گود میں سے پھسل کر اس کے سارے جسم میں پھدکنے لگی تھی ——— پھر ——— پھر اس نے اپنی نظروں کی کمند کو سر پر لٹکتی ہوئی روشنی کی فصیل سے پرے پھینکا۔ اس کی بیوی دیوار سے لٹکی ہوئی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے کلکاری ماری اور اڑ کر اس کے سر پر لٹکتی روشنی کے تھال پر آ بیٹھی اور اس کے ساتھ یوں ہلنے لگی جیسے جھولا جھول رہی ہو۔

اس نے اپنی نظروں کو سمیٹا اور کہنے لگا ——— "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ بچوں کا کیا حال ہے؟ وہ کس کے پاس ہیں؟"

بیوی نے جھولتے جھولتے اپنی قمیص کا دامن اوپر اٹھایا یا دودھ کی ایک دھار اس کے پیاسے منہ پر ماری۔ نمکین دودھ اس کے چہرے کے کٹوروں سے پھسلتا ہوا قطرہ قطرہ اس کے ہونٹوں کی ٹرے میں اکٹھا ہونے لگا۔

ماں ——— اس کے ہونٹوں کے باجے پر گنگناہٹ ہوئی، لیکن دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ وہ تو اس کی بیوی ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں ——— اس کی بیوی کا جسم پگھل رہا تھا اور بوند بوند اس کے سینے پر گر رہا تھا۔ اس نے اچھل کر پرے ہٹنا چاہا۔ لیکن اس کے جسم کی گاڑی کے سارے پہیے پنکچر ہو گئے تھے۔

اس کی بیوی کا جسم قطرہ قطرہ اس کے سینے پر جمع ہو رہا تھا اور ٹھنڈک دھیرے دھیرے اس کے نیچے سرک رہی تھی ——— اسے یاد آیا ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد اس کے گردے کا آپریشن شروع کیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنا چاہا۔ لیکن اس کے سینے پر اس کی بیوی کے جسم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کا اٹھا ہوا سر پھر میز پر آ گرا۔

ڈاکٹر ——— اس کی آواز کا پرندہ پھڑپھڑا کر اڑا۔ لیکن کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر آ گرا۔

ڈاکٹر ——— اس نے سرگوشی کی۔

ڈاکٹر کہاں ہے؟ اس نے سوچا
"ڈاکٹر" ـــــ اس کے ہونٹوں کے پنجرے سے آواز کے سارے پرندے پھڑپھڑا کر اڑے لیکن کمرے کا چکر لگا کر واپس آ گئے۔
ڈاکٹر کمرے میں موجود نہیں تھا۔

سرمئی ابابیلیں اس کے چاروں طرف منڈلا رہی تھیں اور تاریکی کی کنکریاں ایک ایک کر کے اس کے چاروں طرف پھینک رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نظروں کی کدالوں سے تاریکی کی ان چٹانوں کو چیرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی آنکھوں کے پیاسے کاسوں میں روشنی کی ایک بوند بھی نہ گری

پہچان کی ساری رسیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں اور چیزیں اور منظر اس کی آنکھوں کے کیمرے میں جل بجھ رہے تھے ـــــ جل بجھ رہے تھے اور وہ خود تنہائی کی زنجیر سے بندھا اس میز پر گھپ اندھیرے میں بھیگ رہا تھا۔

ایک لمحہ ـــــ ایک سال یا ایک صدی۔ جانے کب سے وہ اس میز پر پڑا وقت کی طنابوں کو انتظار کی کند چھری سے کاٹ رہا تھا۔ کوئی چپچپی ہوئی چیز اس کی پیٹھ کے نیچے سرک رہی تھی۔ شاید ڈاکٹر اس کا آپریشن ادھورا چھوڑ گیا ہو، کیا معلوم اس کا گردہ باہر پڑا ہو یا شاید ڈاکٹر اسے نکال کر ساتھ لے گیا ہو، کیا معلوم ـــــ کیا معلوم،

اس کے سوالوں کی ٹوکری میں سارے انڈے کچے تھے۔ وہ انہیں آنچ دے دے کر تھک گیا تھا لیکن جوابوں کے بچے نہیں نکل رہے تھے۔
سارے سوال منجمد ہو گئے تھے۔

تو ڈاکٹر چلا گیا ہے ـــــ اس نے اپنے آپ سے کہا
بے بسی کی ڈائن تنہائی کا چغہ پہنے کمرے کی دیواروں سے نکلی اور دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب آئی تو وہ سحر زدہ سا ان پتلیوں میں تیرنے لگا۔ وہ آہستہ سے جھکی اور پھر اس نے اپنے لمبے دانت اس کی گردن میں گڑھ دیئے ـــــ اور اداسی، مایوسی، تنہائی کا زہر قطرہ قطرہ اس کے بدن کے مشکیزہ میں ٹپکنے لگا۔

توڑ اکر چلا گیا ہے۔

اس کے بدن کے کھلیان میں بے بسی، اداسی، تنہائی کی کونپلیں لہلہاتی فصلیں بن گئی تھیں اور مایوسی کی پگڈنڈیاں ان میں بے حد گنتی بکھر رہی تھیں۔

وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح میز پر پڑا ان بے شمار کیڑوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے وجود پر رینگ رہے تھے اور اس کے بدن کی نرم سندھوری مٹی میں اپنے گھر بنا رہے تھے۔

اس کا وجود اس فراموش کردہ دیوار کی طرح تھا جس میں مختلف کیڑوں اور پرندوں نے اپنے آشیانے بنائے ہوں اور اب ہر کوئی اپنے گھر کو وسیع اور بڑا کرنے کے لئے اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا چلا جا رہا ہو۔

وہ کھوکھلا تنا تھا جس پر بے بسی اور مایوسی کی موٹی چھال تنی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں بند دروازے کی چوکھٹ سے لٹکی ہوئی تھیں اور وقت کی مکڑی دروازوں کے پٹوں پر انتظار کے جالے بن رہی تھی۔

ایک لمحہ —— ایک سال —— یا ایک صدی، وقت کی گھڑی کا ڈائل بجھا ہوا تھا اور سوئیاں ٹوٹ کر نیچے گر پڑی تھیں۔ اس لئے اسے معلوم نہیں، ایک لمحہ، ایک سال یا ایک صدی —— دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں پہچان کا شعلہ چمکا۔

ایک شخص سفید لباس میں اندر آیا اس نے اپنی نظروں کی کمند پھینک کر اسے جکڑ لینے کی کوشش کی۔ اس شخص کے سر کے بال سفیدی چاٹ رہے تھے اور ہاتھ جھریوں کے دستانوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ وقت کی مکڑی نے اس کے چہرے پر عمر کا جالا بن دیا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے قریب کھڑا رہا پھر کہنے لگا، —— "مجھے معاف کر دینا، میں بھول گیا تھا۔ آج میں ریٹائر ہو رہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں اپنا دراز صاف کر رہا تھا۔ کہ تمہارے کاغذات نکل آئے اور مجھے یاد آیا کہ تم تو آپریشن تھیٹر میں ہی پڑے ہو —— مجھے معاف کر دو"

وہ ندامت کے چند آنسو اس کے کانوں کے پیاسے کٹوروں میں ٹپکا کر باہر چلا گیا۔

دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

ایک لمحہ —— ایک سال —— یا ایک صدی، وقت کبھی بھی اس کا دوست نہیں بنا تھا

اس نے ہمیشہ موقع کی مچان سے اس پر جھپٹ کر وار کیا تھا اور اس بار پھر اس نے اپنی تیز چھُری سے اس کے خیمے کو کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ دن اور لمحے تو اس سے چھین لیے گئے تھے اس لئے اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک لمحہ، ایک سال یا ایک صدی بیت گئی ہے۔

وہ اسی طرح اپنی نظروں کے برمے سے بند دروازے کو چھیدنے میں لگا رہا ——— دروازہ پھر کھلا، ایک نوجوان شخص سفید لباس پہنے اندر آیا۔ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا ——— "میں نیا ڈاکٹر ہوں، پرانے ڈاکٹر نے تمہارے کاغذات ابھی ابھی مجھے دیئے ہیں۔" پھر اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا ——— "مجھے افسوس ہے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑی، میں ابھی آ رہا ہوں۔"

دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

تنہائی، اکیلے پن اور اداسی نے پھر اسے اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ بے بسی اور مایوسی کی چڑیاں اس کے بدن کے آنگنوں میں چوں چوں کرتی پھدکنے لگیں۔

ایک لمحہ ——— ایک سال ——— یا ایک صدی

بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا، خدا جانے یہ ڈاکٹر بھی آئے گا یا پہلے کی طرح اسے آنے والے کے حوالے کر جائے گا۔

کون جانے ——— کون جانے

کمرے میں اڑتی آوازوں کی گرد دھیرے دھیرے نیچے بیٹھنے لگی۔ اور خاموشی کی دیمک اندر ہی اندر اسے چاٹنے لگی۔

دفعتہً اس گھپ خاموشی سے خیال کے سانپ نے پھن اٹھایا اور اس کے سارے وجود کو چاٹنے لگا۔

سب لوگ اسے بھول گئے ہیں۔

اس کی بیوی اس کے محبت کے خیمے سے باہر نکل گئی ہے۔ اس کے بچے اس کے پروں سے پھسل گئے ہیں وہ سب زندگی کی رنگا رنگیوں میں اپنے اپنے خیمے گاڑ رہے ہیں۔

سب اسے بھول گئے ہیں

اور اس کی آنکھوں میں منجمد چشمے پھوٹ بہے۔

گمشدہ آواز کی دستک

وہ اس گھنے شہر میں جس کی جوان چھاتیوں پر رات کو سانس لیتا اندھیرا کروٹیں لیتا ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا خریدنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے یہ زمین مکان بنانے کے لئے چاہیئے۔ لیکن یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی کہ زمین کا یہ ٹکڑا وہ اپنی قبر کے لئے خرید رہا ہے۔ اس بات کا اقرار کرنے کے لئے وہ خود بھی تیار نہ تھا کہ موت اس کے جسم کی ٹوٹی شاخوں پر ابھی پوری طرح نہیں بیٹھی تھی۔ لیکن اس نے کئی دوسرے جسموں کے کھنڈروں میں اسے منڈلاتے دیکھا تھا۔ ویسے بھی قبر کے بارے میں اس کا اپنا ایک تصور تھا۔ لوگ مکان کا ڈیزائن بڑی محبت اور پیسے خرچ کر کے بنواتے ہیں۔ لیکن قبر کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ یہ معاملہ ہر شخص دوسروں پر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اس کا رویہ اس بارے میں مختلف تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنی قبر، اس کا ڈیزائن اور دوسری باتوں کے بارے میں اس طرح سنجیدگی سے سوچتا جیسے یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہو۔ قبر سے اس کی دلچسپی اس وقت سے شروع ہوئی تھی۔ جب وہ اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ قبرستان گیا تھا یا شائد اس سے بھی پہلے ہو۔ لیکن اس کی یادداشت کی البم میں پہلی تصویر اپنے باپ کے جنازے ہی کی تھی۔

قبرستان پہنچ کر لوگوں نے نماز پڑھی تھی - پھر اس کے باپ کو قبر میں اتارا گیا تھا - جب سلیں رکھنے کی باری آئی تو اچانک کسی کو اس کا خیال آگیا - اور اس نے پکار کر اس سے کہا کہ آؤ آخری بار باپ کا چہرہ دیکھ لو - وہ لوگوں کے پیچھے دبکا کھڑا تھا - اس کا نام سنتے ہی سب اس کی طرف دیکھنے لگے - ایک بزرگ اسے بڑی شفقت سے پکڑ کر قبر کے قریب لے آیا - اس نے جھانک کر دیکھا باپ کا چہرہ تو اسے نظر نہ آیا لیکن یہ احساس ضرور ہوا کہ قبر کچھ چھوٹی ہے - اور اس کے باپ کا جسم اس میں پھنسا پھنسا سا ہے - پھر ساری رات اسے یہی احساس ہوتا رہا کہ اس کا باپ قبر کے چوکھٹے میں پھنسا ہوا ہے - اس کے پیر اور سر دونوں طرف کی دیواروں میں دھنسے ہوئے ہیں اور وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے بلا رہا ہے - قبر کے چھوٹے ہونے اور باپ کے دھنسے رہنے کی یہ تصویر اس کے قد کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گہری اور واضح ہوتی چلی گئی - اسی دوران اس کی ماں نے ان کے پڑوسی سے شادی کر لی اور وہ ہائی اسکول میں پہنچ گیا - اس کا نیا باپ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا - لیکن وہ اس کی نفرت کی آگ پر پانی نہ ڈال سکا - وہ جب بھی اپنے نئے باپ کو دیکھتا اسے قبر میں پھنسے ہوئے باپ کے پاؤں یاد آجاتے - اس کی آنکھوں کے صفحوں پر وہ راتیں رینگنے لگتیں - جب اس کا باپ رات کو کراہ کر پانی مانگا کرتا تھا - اس کی آنکھ کھلتی تو ماں موجود نہ ہوتی - وہ اٹھ کر باپ کو پانی پلاتا - پھر صحن میں آتا - لیکن سیڑھیوں میں پھیلے ہوئے آوازوں کے بھنور اسے واپس کمرے میں دھکیل دیتے - ایسی ہی ایک رات کو اس کے باپ نے پانی مانگا اور پھر ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا - اس کی ماں کہتی تھی کہ اس کا باپ اسی رات مرا ہے - لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے کئی راتیں پہلے ہی مر گیا تھا - وہ تو اس لاش کو پانی پلایا کرتا تھا -

اور اب کئی سال دیمک لگ لگ کر عمر کی ردی کی ٹوکری میں گر گئے تھے - لیکن اسے اب بھی سوتے ہوئے اپنے باپ کے پاؤں یاد آتے - پھر محسوس ہوتا کہ اسے بھی قبر میں اتار دیا گیا ہے - قبر چھوٹی ہے لیکن دفن کرنے والے اسے زبردستی ٹھونک ٹھانک کر اس میں فٹ کر گئے ہیں اور سلیں لگا کر بھاگ گئے ہیں - گھپ اندھیرے میں اسے اپنے پاؤں دیواروں میں پھنسے ہوئے محسوس ہوتے - وہ ہل ہل کر انہیں سیدھا کرنے کی کوشش کرتا - لیکن پاؤں اور پھنستے چلے جاتے - پھر جب اس کی بیوی اس کی بڑبڑاہٹ

سن کر بتی جیلاتی تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کے پاؤں تو کمبل میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ چونک کر بیوی کو دیکھتا اور پھر اس سے پوچھتا ——

ہمارے دائیں طرف کون رہتا ہے؟

وہ کہتی —— "آپا صدیقہ"

وہ کہتا —— "نہیں۔ اس کے خاوند کا نام بتاؤ"

وہ کہتی —— "حاجی عبدالغفور"

وہ پوچھتا —— "اور بائیں طرف"

وہ کہتی —— "اچھن خان"

اور پھر پوچھتا —— "اور پچھلی طرف"

وہ کہتی —— "عبدالمجید"

"اور سامنے"

"عبدالمنان"

"اور اوپر"

وہ جھنجھلا کر کہتی —— "خدا"

لیکن وہ اس کی جھنجھلاہٹ کو محسوس کئے بغیر اسی سنجیدگی سے پوچھتا "اور نیچے" ایک دو منٹ تک اس کی بیوی کو کچھ نہ سوجھتا پھر وہ غصے سے کہتی —— "قبرستان"۔ قبرستان کا لفظ سنتے ہی اس کے ذہن میں پہلے قبر اور پھر اپنے باپ کے پھنسے ہوئے پاؤں ابھرتے۔ اسے لگتا جیسے قبر کی دیواریں اسے چاروں طرف سے دبا رہی ہیں۔ وہ سکڑتا چلا جاتا۔ یہاں تک کہ قبر ہی قبر باقی رہ جاتی۔ وہ سوچتا —— وہ ہے ہی نہیں اور ساری رات وہ اسی ہے اور نہیں کی کش مکش میں الجھا کبھی کئی سال پیچھے جاتا کبھی کئی سال آگے نکل آتا۔ اسے اپنی ماں یاد آتی اور اس کے ساتھ ہی میٹھے دودھ کی ایک پھوار اس کے پیاسے ہونٹوں کے بنجر کھیتوں کو سیراب کر جاتی پھر سیڑھیوں پر پھیلے ہوئے بھنور اس کے کانوں میں بوند بوند سرگوشیاں ٹپکاتے اور قبر کی دیوار میں پھنسے ہوئے باپ کے پاؤں اس کے جسم میں داخل ہو جاتے۔ وہ آنکھیں بند کئے چیخ سے اٹھتا

اور دو ڈکر بیوی سے لپٹ جاتا، ساری رات "ہے اور نہیں" کی اس کش مکش میں وہ کبھی دھندلاتے دھندلاتے نقطہ بنتا۔ کبھی بکھرا ہوتے ہوتے سارے بستر پر پھیل جاتا اور ایک رات کے بعد دوسری رات اس طرح جسم کی چادر پر گدگدیاں کرتے ہوتے گزرتی چلی جاتی۔

کئی بار اس نے سوچا ساری خرابی اس بستر کی ہے۔ جس میں داخل ہوتے ہی اسے قبر یاد آجاتی ہے۔ پھر کئی بار اس نے سوچا ساری خرابی اس کی بیوی کی ہے جو سرِ شام ہی منہ لپیٹ کر سو جاتی ہے۔ کئی بار اس نے یہ سوچا کہ ساری خرابی اس کے بیٹے کی ہے جو کتابوں کے صحن سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ یا پھر ساری خرابی اس مکان کی ہے جس کی دائیں طرف حاجی عبدالغفور، بائیں طرف اچھن خان، پچھلی طرف عبدالمجید، سامنے عبدالمنّان رہتے ہیں۔ اور اوپر —— اوپر نہ جانے کیا تھا۔ لیکن نیچے قبرستان ضرور تھا اور سارا مسئلہ قبر کے خیال سے گڑبڑاتا تھا۔ اس لئے وہ زمین کا ایسا ٹکڑا خریدنا چاہتا تھا جس میں وہ اپنی مرضی سے مکان بنوا لے اور اس کے نیچے اپنی مرضی کی قبر۔

لیکن زمین خریدنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ بس میں تو شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ ساری زندگی دوسروں نے ہی اس پر حکومت کی تھی۔ پہلے وہ ماں سے ڈرتا تھا۔ اب بیوی سے اور مرنے کے بعد ان فرشتوں کا خوف تھا جو قبر میں اس کا حساب لینے آئیں گے۔ خوف، خوف —— خوف اس نے زندگی کی ٹرے سے بس ایک ہی چیز چنی تھی، باقی ساری چیزیں تو اسے سیکنڈ ہینڈ ہی ملی تھیں۔ شوکیسوں میں لگی ہوئی چیزوں کو تو وہ للچا للچا کر دیکھ ہی سکتا تھا اور پھر جب یہی چیزیں پرانی ہو کر شوکیسوں سے نکل کر ہر مال دو دو روپے والی ریڑھی پر آتیں تو اس کے نام کی چٹ بھی نکل آتی۔ اس کے گھر کی ہر شے جس میں اس کی بیوی بھی شامل تھی سیکنڈ ہینڈ اور ہر مال ڈو ڈو روپے والی ریڑھی سے خریدی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا وہ اپنا باپ ہے اور اس کی بیوی اس کی ماں ہے۔ اس کی ماں ایک بڑے گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی اس غلط فہمی میں ہو گئی کہ اس کے باپ کے ظاہری رکھ رکھاؤ کے پیچھے ایک بڑی جائیداد ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ لیکن اس کے باپ کے گھر میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ تو سفید پوش ہے اور یہ بات وہ ساری زندگی نہ بھولی۔ وہ جب بھی

لفظوں کو چوس چوس کر ان کا پھوک اس کے باپ کے ننگے منہ پر مارتی تو اس کا باپ سہم جاتا اور قطرہ قطرہ زمین پر ٹپکنے لگتا۔ زمین پر گرتے ہی اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ اس کا باپ نہیں۔ بلکہ وہ خود ہے۔ پھر اس کی بیوی سارے کمرے میں ناچتی اور پہلوانوں کی طرح دونوں رانوں پر ہاتھ مار مار کر اسے مقابلے کی دعوت دیتی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا تو معلوم ہوتا کہ اس کے دونوں پاؤں تو قبر کی دیوار میں پھنسے ہوتے ہیں۔ پھر قبر سکڑنے لگتی۔ اس کے جسم کی ہڈیاں دیواروں کے بوجھ سے کڑ کڑا کر ٹوٹنے لگتیں اور ایک اداس لے اس کے ہونٹوں کی بانسری پر ابلنے لگتی —— پھر سِل رکھنے کی آواز، دوسری سِل، تیسری سِل اور پھر مٹی کا ایک ڈھیر۔

صبح جب وہ بستر سے اٹھتا تو سارا جسم مٹی میں لتھڑا ہوا ہوتا، پاؤں دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی اور زمین کا ٹکڑا لینے کی خواہش کبوتر کی طرح اس کے دل میں پھڑپھڑانے لگتی۔

اور آنے والی رات بیوی سے وہی مکالمہ

ہماری دائیں طرف کون رہتا ہے ؟

بائیں طرف کون ؟ ——

اور اسی مکالمے کے دوران جس کے لفظ ہمیشہ ایک ہی ہوتے اس کا بیٹا اسکول سے کالج میں پہنچ گیا۔ ڈرائینگ روم میں پرانی کرسیوں کی جگہ نئے ڈیزائن کے صوفے نے لے لی۔ دری کی جگہ قالین بچھ گیا۔ لیکن زمین خریدنے کی خواہش اسی طرح پھیلتی رہی وہ ہر ایک ملنے والے سے کہتا مجھے کوئی سستی سی زمین لے دو، میں مکان بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن زمین کے ٹکڑے آسمان کے ٹکڑوں جتنے مہنگے تھے۔ ان کی قیمت سن کر اس کا دل نارسائی کی مٹھیوں میں سکڑنے لگتا۔ اور ایک بھیگی تمنا ہونٹوں کی وادیوں میں ٹمٹمانے لگتی۔ زمین خریدنے کی خواہش دیمک بن کر اس کے جسم کو اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہی تھی۔ کئی بار اس نے کوشش بھی کی کہ خواہش کے اس پرندے کو پکڑ کر اس کے پر نوچ ڈالے لیکن وہ جب بھی اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھتا پرندہ ایک ڈالی سے اڑ کر دوسری ڈالی پر جا بیٹھتا۔ دو ایک بار اس نے جھپٹا مار کر اسے دبوچنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن دو ایک پرون

——— کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

پرندہ اسی طرح پھدکتا رہا اور اس کی زندگی کی میز سے کئی اور سفید کاغذ لفظوں کے حمل سے کالے ہو کر وقت کی ویسٹ پیپر باسکٹ میں جا گرے۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک وہی تکرار ——— وہی خواہش اور ہر رات سونے سے پہلے وہی مکالمہ،

ہماری دائیں طرف کون رہتا ہے۔

بائیں طرف

پچھلی طرف

سامنے

اوپر

اور نیچے

قبرستان کے ساتھ ہی قبر کا تنگ دہانہ اور دیواروں میں پھنسے ہوئے پاؤں اور دن کے رسے پر ایک صبح سے دوسری صبح کی گرد میں چھلانگ لگاتے ہوئے کئی باتیں ادھر ادھر ہو گئیں۔

ایک ایسی ہی صبح جب وہ ابھی جسم سے اندھیرے کی گرد جھاڑ کر ناشتہ کی میز پر آیا ہی تھا۔ کہ اس کا ایک دوست آگیا اور آتے ہی بولا

"لو بھئی خوش ہو جاؤ، ایک بہت سستی زمین مل گئی ہے۔"

اس نے کہا ——— "تو لے لو۔"

دوست نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ——— "میں تمہارے لئے کہہ رہا ہوں لیکن میں زمین لے کر کیا کروں گا؟ ———" اس نے توس پہ مکھن لگاتے ہوئے کہا۔"

دوست حیرت کی پھلجھڑیوں کی چنگاریوں سے خود کو بچاتے ہوئے ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا ——— "خود ہی تو کہتے تھے کہ مکان بناؤں گا۔ یہ مکان تو کرائے کا ہے نا ———"

وہ کچھ دیر چپ رہا ۔ پھر آہستگی سے کہنے لگا ——— "دراصل میں نے اسی مکان کے نیچے قبر بنالی ہے ۔ خوب لمبی چوڑی ہے ۔ اتنی کہ اس میں آسانی سے اٹھا بیٹھا اور چلا پھرا جاسکتا ہے"۔

شناسائی، دیوار اور تابوت

جب ڈاکٹر اس کی آنکھوں کی موم کلیوں میں منظروں کے لک چھپ جانے کا تماشا بجھ چکا۔ تو اسے پہننے لیے یہ خبر سنائی کہ اس کی آنکھوں کی آرٹ گیلری میں زندگی کی زنگار رنگ تصویریں ابھی دھندلائی نہیں۔

ڈاکٹر کی بات سن کر وہ پنجوں کے بل کرسی کی گود میں سے نکلا اور کمرے دیوار پر چڑھنے لگا پھر چھت سے لٹک کر اس نے کلکاری ماری اور کہنے لگا ——— "تو پھر میری بیوی میری بات کی تصدیق کیوں نہیں کرتی؟"

"کس بات کی تصدیق؟" ڈاکٹر اس کی آواز کے گیند کو دبوچتے ہوئے بولا۔

"یہی کہ ہمارے گھر کی دیواروں پر بے رُخی کی کونپلیں اُگ آئی ہیں اور چھت سے اجنبیت کے زردے جھڑتے ہیں۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں حیرت کی شمعیں پھڑ پھڑائیں ——— "میں سمجھا نہیں۔"

اس نے کمرے کی چھت پر ایک چکر لگایا اور بولا ——— "آپ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ

پھر دفعتاً اس نے چونک کر اپنے آپ کو آواز دی اور دوڑ کر ہونٹوں کے ہارمونیم بجاتے ہوئے باقی کے

جملے کی گردن مروڑ دی - جملہ ٹوٹ کر فرش پر گر گیا - اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور ٹوٹے ہوئے جملے کو ڈاکٹر کی جیب میں ٹھونس کر اسے حیرت کی گلیوں میں اکیلا چھوڑ باہر نکل آیا -

بڑی سڑک پر زندگی بدستور گھسٹ رہی تھی - اس کے تلووں نے سڑکوں کی مانوسیت کو بوسہ دیا اور اس کے پاؤں خود بخود دفتر کی طرف چل پڑے - آج کل اسے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک مشین کی طرح ہے جس کا کنٹرول سوئچ صبح نو بجے سے شام چار بجے تک دفتر کی عمارت میں ہوتا ہے - لیکن جب وہ دفتر کا موڑ مڑنے لگا تو خیال کی ریت اس کے ذہن کی خالی تھالی میں سرسرائی - کیوں نہ میں بیوی کو بتاتا چلوں - کہ میری آنکھوں کے ڈربوں میں ابھی بے بسی کے کبوتر نہیں پھڑ پھڑاتے اور آج تو اس کی رسی بھی اتنی لمبی تھی کہ ڈاکٹر سے ہوتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لئے کہیں بھی جا سکتا تھا -

گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے پھر ٹیڑھی دیواروں اور لمحہ بہ لمحہ سرکتی چھت کا خیال آیا - کبھی اس کے گھر کی دیواروں پر سانس لیتے گرم رنگ لکن میٹی کھیلتے تھے - وہ جب گھر آتا تو اس کی بیوی کی گرم گداز بانہیں اس کے جسم پر بچھی ہوئی دفتری بوریت کی تہوں کو کھرچ کھرچ کر اتار دیتیں اور اس کی بیوی کے بدن میں دہکتی ہوئی بھٹی اس کے ذہن کے تالاب پر منڈلاتی خیالوں کی مکڑیوں کو پل بھر میں پگھلا دیتی - وہ اچھل کر بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے ناچتا - ناچتا اور ناچتے ناچتے نیند کی دلدلوں میں ڈوب جاتا -

صبح کرنوں کی کرنیں اسے نیند کی گہری دلدلوں سے باہر نکالتیں —— جب وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا ہوتا تو اس کی بیوی اپنی توجہ کا سائبان اس پر یوں تان دیتی کہ گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک اسے دیکھتی ہی رہ جاتی -

اس کی بچی توتلی زبان میں اسے بار بار یاد دلاتی کہ واپسی پر اسے کیا کیا لانا ہے اور پھر جب نو کا ہندسہ سوئیوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیتا تو وہ ہڑبڑا کر سائبان میں سے نکل آتا - لیکن اس کی بیوی اسے پھر اندر گھسیٹ لیتی اور کہتی —— "گھڑی تو دس منٹ آگے ہے - دس منٹ تو رک جائیے "

اور وہ یہ جانتے بھی کہ گھڑی کی سوئیاں صحیح وقت کی گواہی دے رہی ہیں - دس منٹوں کے لئے بیوی کے آنچل میں لپٹا رہتا - اس کی بیوی اور بچی اسے دروازے تک چھوڑنے آتیں اور جب تک وہ

لگی سے باہر نہ نکل جاتا، ہاتھ ہلاتی رہتیں، اور یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اس کے گھر کی دیواروں سے خوشبو کے رنگ برسا کرتے تھے، لیکن ایک رات لیٹے لیٹے اس کی نظر دیواروں پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ دیواریں ٹیڑھے پن کی بے رنگیوں میں ڈوب رہی تھیں اور چھت ان کے ہاتھوں سے سرک رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ جو منہ دوسری طرف کئے سو رہی تھی۔

اس رات تنہائی نے اس پر پہلا فائر کیا۔

ایک لمحے کے لئے اسے وہ راتیں یاد آئیں جب بستر پر لیٹتے ہی اس کی بیوی اپنے بدن کی چادر پھیلا دیتی تھی۔ لیکن اب اس کی بیوی لیٹتے ہی سو جاتی ہے۔

اس نے جھک کر بیوی کے چہرے کو کریدنا چاہا۔ لیکن اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی موڑ نہیں تھا ہاں اب بہت دنوں سے اس کی بیوی کے چہرے پر کوئی موڑ نہیں ہے۔ لیکن شروع شروع میں ان دونوں کے چہروں پر اتنے موڑ اور سلوٹیں تھیں کہ وہ پہروں ایک دوسرے کے چہرے کی انجان نیم تاریک گلیوں میں کھوئے رہتے تھے۔ لیکن اب اس کی بیوی کا چہرہ ایسے میدان کی طرح ہے جس کا ایک ہی چکر کاٹ کر وہ اُکتا جاتا ہے اور اس کا جسم ——— اس کی طنابیں اب ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور جسم کا خیمہ ڈولنے لگا ہے۔

اس کے گھر کی دیواروں کے گھونسلوں میں اجنبیت کے کبوتر غٹر غوں غٹر غوں کر رہے ہیں۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے پھر ٹیڑھی دیواروں اور لحہ بہ لحہ سرکتی چھت کا خیال آیا۔ اسے یاد آیا کہ جس رات اس نے پہلی بار دیواروں پر اجنبیت کے جلتے بجھتے نیون سائن کی تحریر پڑھی تھی۔ اس نے بیوی کو جھنجھوڑ کر نیند کی گود میں سے باہر کھینچا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھی ——— "کیا ہوا؟"

"دیکھو ——— دیکھو" اس نے دیواروں اور چھت کی طرف اشارہ کیا "ہمارے گھر کی دیواریں اپنے سائے سمیٹ رہی ہیں!"

بیوی کے چہرے پر بے یقینی کے آنچل نے ایک لمحہ کے لئے سایہ کیا، پھر وہ اسے بچے کی طرح تھپکی دیتے ہوئے بولی ——— "سو جاؤ شاباش ——— سو جاؤ!"

کچھ دیر بعد وہ تو سو گئی مگر وہ ساری رات اجنبیت کے پنگوڑے میں ہچکولے کھاتا رہا۔

کہ کسی بھی لمحے چھت دیواروں کی بانہوں سے پھسل کر اس کی جھولی میں آن گرے گی ۔ صبح اس نے پھر دیواروں اور چھت پر پھوٹتی ہوئی ٹیڑھے پن کی کونپلوں کا ذکر چھیڑا ۔ لیکن اس کی بیوی نے بات کو سمیٹ کر صحن کی نالی میں پھینک دیا اور بولی —— "دفتر دیر ہو رہی ہے"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا ۔ نو بجنے میں تو ابھی دس منٹ تھے ۔

" ابھی تو دس منٹ ہیں " اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا ۔

" گھڑی پیچھے ہے " بیوی نے گھڑی کی ٹک ٹک کو پہیے لگا دیئے اور اسے دروازے سے باہر دھکیل دیا ۔

اور اب اس کی بیوی نو بجنے سے پہلے ہی اسے دفتر سے دیر ہو جانے کا احساس دلانے لگی ہے اور اگر وہ دیواروں اور چھت کا ذکر کرتا ہے تو ان سُنی کرتے ہوئے بے شمار مسئلوں میں سے کسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہے ۔

ایک دن جب اس نے اصرار سے بیوی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے گھر کی دیواریں روز بروز اپنی جڑیں چھوڑتی جا رہی ہیں تو اس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس جائے ۔ یوں بھی پچھلے کئی دنوں سے رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں دیئے جلنے لگے تھے ۔ اس لئے جب بیوی نے اسے یہ مشورہ دیا تو وہ اگلے ہی دن آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس چلا آیا ۔ لیکن اب گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی بیوی کی آنکھوں میں دھندلاہٹیں گنگنا رہی ہوں اور دیواریں اور چھت سچ مچ سرک رہے ہوں ۔ یہ خیال آتے ہی اس کی مٹھیاں جوش کی پھسلن سے کھل گئیں —— یقیناً یہی بات ہے ۔ اسی لئے اس کی بیوی کو دیواروں کا ٹیڑھا پن نظر نہیں آتا اور اسی لئے صبح نو بجے سے پہلے ہی نو کا اعلان کر کے وہ اسے دفتر کی پیاسی ، بھوکی بانہوں میں دھکیل دیتی ہے اور شاید اسی لئے اس کی جسم کی چادر میں سے خوشبو کی گرم بھاپ نہیں اٹھتی ، اسی لئے وہ بستر پر گرتے ہی سو جاتی ہے ۔ اتنی جلدی کہ پہلے کی طرح اس کے سونے کا بھی انتظار نہیں کرتی ۔

ہاں یقیناً اس کی بیوی کی آنکھوں میں دھندلاہٹ گنگنا رہی ہے ۔

گھر کی دہلیز کو چھوتے ہی اس نے چیخ کر بیوی کو پکارا —— " لو بھئی میں تو دھندلاہٹ

کے سراب سے نکل آیا ہوں ، اب تم ------"

لیکن اس کا جملہ ٹوٹ کر اس گہری اجنبیت کی گود میں گر پڑا جس نے سارے گھر کو اپنی بغل میں دبا رکھا تھا۔ تنہائی نے مورچے لگا کر اس پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔

—— اسے وہ دن یاد آئے جب وہ گھر لوٹتا تو اس کی بیوی ڈیوڑھی میں اس کی منتظر ہوتی۔ کئی بار اس نے حیرت سے پوچھا بھی تھا —— "تمہیں کیسے معلوم ہوتا ہے کہ میں آ رہا ہوں ؟"

اس کی بیوی جواب دیتی —— "جب تم گلی میں داخل ہوتے ہو تو مجھے تمہاری خوشبو آ جاتی ہے۔"

اور اب وہ اکیلا ڈیوڑھی کے تابوت میں کھڑا اجنبیت کی اس دھند کو چیرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دفعتہً ایک سریلی آواز صحن کی دیواروں سے رِسنے لگی —— وہ لپک کر صحن میں گیا۔ اور ٹھٹھک کر رہ گیا۔

صحن کی دیوار پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا —— جس کے چاروں ہاتھوں میں مختلف ساز تھے۔ وہ ان سب کو بیک وقت بجا رہا تھا اور اس کی بیوی سارے صحن میں ناچتی پھر رہی تھی۔ اس نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے سارے جسم پر آنکھیں ہی آنکھیں —— ہونٹ ہی ہونٹ —— اور ہاتھ ہی ہاتھ تھے۔

وہ تو آواز تھا —— سراپا آواز !

تنہائی ، دکھ ، شرم اور شکست کے کئی ملے جلے احساسوں کی چیونٹیوں نے اس کے تلووں میں کاٹنا شروع کر دیا۔ اسے لگا جیسے وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر پرے ہٹ گیا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔

دفتر جانے کی بجائے وہ سارا دن شہر کی سڑکوں پر لوگوں کے چہرے گنتا رہا۔ شام کو جب وہ معمول کے مطابق گھر آیا تو بیوی نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا بیوی کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے لقمہ توڑا اور ایک لمحے کے لئے اسے وہ دن یاد آئے جب اس کی بیوی اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھاتی تھی۔

کھانے کے بعد وہ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی بیٹی اسکول کا کام کر رہی تھی۔ وہ

دیر تک اخبار کی سرخیاں کھرچتا رہا۔ اس دوران اس نے بار بار صحن کی دیوار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھی
پھر اس نے گھر کی اک اک دیوار ٹٹولی۔ بے رخی کی کونپلیں اب لہلہا کر درخت بن گئی تھیں اور اجنبیت کی
سفیدی موسلا دھار بارش کی طرح چھت سے گر رہی تھی۔

وہ بے دم ہو کر کرسی کی قبر میں گر پڑا۔

رات کو وہ جب سونے لگے تو بیوی نے پوچھا ——— "ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"ملا نہیں" اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا، اور پہلو بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن نیند نہیں آئی
وہ ساری رات آنکھوں کے سامنے پھڑپھڑاتی ہوئی نیند کی لاش کو آنکھوں کے تابوت میں دفن کرنے کی کوشش
کرتا رہا۔ لیکن آواز کی رسی سے لٹکتی ہوئی نیند کھلکھلا کر بھاگ جاتی ——— پھر اس نے صحن کی دیوار پر بیٹھے
ہوئے شخص کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن جونہی اس کی باہیں اس کے قریب پہنچتیں، وہ کبھی پھیل
کر کبھی سمٹ کر ——— کبھی سمٹ کر کبھی پھیل کر ——— اس کی باہوں کی پرکار سے باہر نکل جاتا۔

صبح جب اس کے جسم کا ڈبہ دفتر جانے والی لائن پر پھسلنے لگا تو بیوی نے اسے یاد دلایا کہ اسے
ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے، وہ جواب دیئے بغیر گلی میں آیا لیکن جب دفتر کا موڑ مڑنے لگا تو خود بخود
اس کے پاؤں گھر کی طرف اٹھ گئے۔

دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے اندر کی ایک ایک شے کو سونگھا، اس کا گھر اسی طرح اجنبیت کی بغل
میں سر رکھے سو رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں ڈیوڑھی میں آیا، آواز صحن کی دیواروں سے رس رہی تھی۔

اس نے اندر جھانکا ——— وہ شخص صحن کی دیوار پر بیٹھا اپنے چاروں ہاتھوں سے مختلف ساز بجا
رہا تھا، اور اس کی بیوی سارے صحن میں ناچتی پھر رہی تھی۔

اس نے پھر دیوار پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی چہرہ نہیں تھا۔
اس کے جسم پر ہونٹوں کی جھاڑیوں، کانوں کے کاسوں، آنکھوں کی کھڑکیوں اور ہاتھوں کے جنگل کے
سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لئے اسے خیال آیا کہ دوڑتا ہوا جائے اور دیوار سے گھسیٹ کر اس کا گلا گھونٹ
دے ——— لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے اٹھے ہوئے قدم ہوا ہی میں منجمد ہو گئے، اگر کسی نے دیکھ لیا
——— وہ لوگوں کی آنکھوں کی عدالت میں تنہا کھڑا تھا۔

اس نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ جس کی منڈیروں سے سناٹا جھانک رہا تھا۔ لیکن کیا معلوم عین اس وقت کوئی آجائے ——— تو پھر، تو پھر وہ دبے پاؤں کوٹھے پر آیا۔

منڈیروں پر اٹھکیلیاں کرتیں سورج کی کرنیں اسے دیکھ کر سایوں کے آنچل میں سمٹ گئیں۔ اس نے آہستہ سے سر نکال کر پڑوس والے صحن میں جھانکا اور اس کے ہونٹوں کے تالوت میں چیخ کی ممی پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

ساتھ والے صحن کی دیوار پر بھی وہ موجود تھا اور پڑوس والے کی بیوی اس کی لے پر ناچ رہی تھی وہ دوڑ کر دوسری طرف گیا —— تیسری طرف پھر چوتھی طرف ——— اس کے سارے جسم پر آنکھیں اور کان اُگ آئے۔

آوازکے رنگ اس سرے سے اس سرے تک سارے صحنوں کی دیواروں پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور صحن صحن سبھی اپنے کانوں کے کاسے پھیلائے آوازکے شہد کو لوند لوند سمیٹ رہی تھیں۔

اس کے ڈگمگاتے قدم سنبھل گئے

تو میں اکیلا نہیں

اس نے سر ہلایا اور چپ چاپ باہر آگیا۔

شام کو جب وہ گھر آیا تو کھانا کھاتے ہوئے اس نے بیوی سے کہا ——— "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میری آنکھوں میں دھندلاہٹوں نے خیمے گاڑ لئے ہیں"

بیوی نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا ——— "تو اب عینک منگوانے میں دیر نہ کرو"

دوسرے دن جب وہ زبردی عینک لگا کر گھر آیا تو بیوی کے چہرے پر اطمینان کنڈل مارے بیٹھا تھا۔ کہنے لگی ——— "اب تو تمہیں ٹھیک نظر آتا ہے نا"

"ہاں" ——— اس نے ٹیڑھی دیواروں اور سرکتی چھت پر اگی ہوئی بے رخی اور اجنبیت کی لہلہاتی فصلوں کو دیکھتے ہوئے کہا ——— "اب سب کچھ ٹھیک ہے"

اور اس نے سر ہلایا ——— "ٹھیک ہے، شاید ٹھیک ہی ہے"

ڈوبتی پہچان

سورج جب قبرستان کے گھنے درختوں سے الجھتا رینگ کر اپنے بل میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مستری نے قبر کا کام مکمل کر لیا۔

پچھلے کئی مہینوں سے اس کی یہ خواہش تھی کہ ماں کی قبر پکی کرائے لیکن خالی جیبیں اس خیال کو تھپتھپا کر آنے والے دن کی جھولی میں ڈال دیتیں، وہ اندر اندر ہی سلگ سلگ کر خیالوں ہی خیالوں میں کبھی اینٹیں کبھی سیمنٹ، کبھی ریت خریدتا، نام کی خوبصورت سی سل بنواتا اور سونے سے پہلے اس خیال کو پوری توجہ سے آنے والے دن کی جیب میں ڈال دیتا۔ بہت دن ہوتے اس کے ڈرائینگ روم میں ایک تصویر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اسکی ماں کی تصویر ہے، لیکن مجیھ کا کہنا تھا کہ یہ کوئی خیالی تصویر ہے ... تصویر میں ایک عورت غم میں گندھی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے خالی منظر کو گھور رہی تھی۔ خالی یوں کہ منظر میں جو وادی تھی۔ وہ اپنے دریاؤں کے باوجود دست بدعا تھی۔ وہ اس تصویر کے بارے میں جاننے کا شوق تو رکھتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس تصویر کی وادی اتنے سارے دریاؤں کے باوجود کسی بنجر دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ دریاؤں کا پانی سوکھ کیوں گیا ہے اور زمین کے ہاتھ خالی کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ لیکن اس کے لئے اس نے کبھی لمبی چوڑی چھان بین نہیں کی۔ ایک دو بار ماں سے پوچھا مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ بلکہ

الٹا اس سے پوچھ بیٹھی کہ وہ تصویر کے بارے میں اتنا متجسس کیوں ہے۔

جب کبھی وہ ڈرائینگ روم میں اکیلا ہوتا تصویر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی وہ اس کے خطوط میں شناسائی کی روشنی تلاش کرتا۔ بہت پہلے جب وہ چھوٹا تھا اس نے اپنے باپ سے بھی یہی سوال کیا تھا۔ باپ نے جواب دینے کی بجائے الٹا اسے تیز نظروں سے گھورا اور کہا ...." تم اپنی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہے "۔

جس دن اس کا باپ فوت ہوا تصویر بلک بلک کر روئی۔ لیکن اس وقت اسے اپنا ہوش نہیں تھا وہ خود چھلک چھلک کر رو رہا تھا۔ بعد میں دوسرے تیسرے دن جب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو اس نے ماں کو بتایا کہ تصویر بھی روئی تھی .... ماں ہنس پڑی .... "پگلے کہیں تصویریں بھی روتی ہیں" ماں کی ہنسی گہرے غم میں گندھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ کہے بغیر ڈرائینگ روم میں چلا آیا اور تصویر کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ آنکھیں صاف دھلی ہوئی تھیں۔ اسے شبہ سا ہوا کہ ان میں نمی تیر رہی ہے۔ اور منظر اپنی وادی سمیت بھوک کی دھند میں لپٹا اپنی پہچان کھو رہا ہے۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک عورت ہونٹوں پر غم میں گندھی مسکراہٹ سجائے سامنے کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ وادی جس کی راہیں خشک ہوتی جا رہی تھیں اور ہونٹوں پر نفرتوں کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ وہ اونگھ گیا۔

اس کی ماں مر رہی تھی اور تصویر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھا جس دن برسات کی پہلی جھڑی لگی۔ وہ ساری رات کروٹیں لیتا رہا۔ بار بار خیال آتا کہ پانی قبر میں گھس گیا ہے اور ماں سردی سے ٹھٹھرتی دیوار سے لگی اسے آوازیں دے رہی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ بارش میں بھیگتا قبرستان آیا۔ قبر ٹھیک ٹھاک تھی لیکن اسے شبہ رہا کہ پانی کہیں نہ کہیں سے رس رس کر اندر جا رہا ہے وہ گورکن کی کوٹھڑی میں پہنچا وہ چائے پی رہا تھا۔ اس کی بات سن کر اس نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا .... "فکر نہ کرو پانی اندر نہیں جا سکتا "۔

"پھر بھی کسی اور طرف سے .... میرا مطلب ہے نیچے ہی نیچے کہیں سے "۔ گورکن دو تین لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا ....." اچھا بارش بند ہو جائے تو میں تھوڑی سی مٹی اور ڈال دوں گا "۔

وہ اطمینان سے سر ہلاتا واپس آ گیا۔ اگلے دن بارش پھر ہوئی اور زور شور سے ہوئی۔ وہ بھیگتا بھیگتا

صبح سویرے قبرستان آیا۔ بہت سی قبریں بیٹھ گئی تھیں۔ مگر اس کی ماں کی قبر اس طرح تھی۔ پھر بھی اسے شبہ رہا کہ وہ بیٹھ رہی ہے۔ گورکن اس کی بات سن کر بولا ... "تو پھر پکی کرا لو"۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔" واپس آتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن قبر پکی کرانے کے لئے اس کے پاس پیسے جمع نہ ہو سکے۔ بارشیں روز ہوتیں وہ قبرستان جاتا ہر روز کچھ اور قبریں بیٹھ جاتیں۔ اسکی ماں کی قبر بھی خاصی نیچی ہو گئی۔ تاہم ابھی اسکی شکل و صورت قائم تھی۔ ساری رات اسے یہی احساس رہتا کہ پانی بوند بوند اندر جا رہا ہے اور اس کی ماں سردی سے ٹھٹھری دیوار سے لگی اسے آوازیں دے رہی ہے۔ تصویر نے بھی چپ سادھ رکھی تھی۔ غم میں گندھی مسکراہٹ پتھر ہو گئی تھی۔ شاید اس نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا ہے، لیکن پیچھے تو گہرا اندھیرا ہے اور آگے دھند ہی دھند... ... دھند۔ اس دھند میں سنبھل سنبھل کر، قدم قدم چلتا، وہ گھوم پھر کر اس غم آلود مسکراہٹ کی چاردیواری میں لوٹ آتا۔ کبھی تو یہ مسکراہٹ غم کی قید سے آزاد ہو گی۔ وہ سوچتا اور ہر صبح تصویر کی دہلیز پہ آ کھڑا ہوتا۔ لیکن مسکراہٹ اس طرح غم آلود، سامنے کا منظر اداس۔ وادی کے بلکتے بھوکے چہرے ویران مسکراہٹ غم آلود منظر کا چہرہ اداس، ضرورتیں نوکیلے ناخنوں سے اس کے جسم کو مسلسل ادھیڑ رہی تھیں۔ بھٹی انگلیوں سے جینے کی موہوم امیدوں کو ٹٹولتا وہ بے دم ہو گیا اور سوچنے لگا اگر تصویر بیچ ڈالے تو ڈھیر سارے روپے مل سکتے ہیں۔ ایک دوست نے ایک بار کہا تھا ... "اس تصویر کو کوئی بھی غیر ملکی مہنگے داموں خرید لے گا۔" تصویر بیچنے کا خیال شاید اسی دن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت اسے یہ بات اتنی بری لگی کہ وہ اس دوست سے سچ مچ لڑ پڑا۔ مسکراہٹ غم آلود، سامنے کا منظر دھندلا۔ ضرورتوں کے ہاتھ لمبے اور لمبے ہوتے چلے گئے۔ اس نے ایک دن چپکے سے تصویر بیچ ڈالی۔

ڈھیر سارے پیسے ملے تو خالی ہاتھ سمٹ گئے اور آسائشیں خود بخود اس کی دسترس میں چلی آئیں۔ دن کی سختی میں نرمی آ گئی... لیکن رات کو تصویر کی خالی جگہ اس کی ماں آ کھڑی ہوتی اور غم آلود مسکراہٹ کے ساتھ بڑی حسرت سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس نے سوچا اس کی وجہ جگہ کا خالی ہونا ہے۔ سو اس نے وہاں کلینڈر ٹکا لیا۔ کلینڈر رکھنے سے دن اور مہینے اس کی مٹھی میں آ گئے۔ ماں اب خواب میں آنے لگی وہی غم آلود مسکراہٹ اور حسرت بھری نظریں اس نے سوچا شاید ماں قبر میں خوش نہیں۔ قبر پکی کروانے کا خیال پھیل کر اس کے پورے وجود پہ چھا گیا۔ قبر پکی کرنے کا کام اگلے دن شروع ہو گیا۔ دو مستریوں نے شام تک کام کر لیا۔ نام کی سل بھی لگ گئی۔ اس رات وہ عجیب طرح کی نیند سویا۔ خواب میں اس نے دیکھا وہ

بہت بڑے کمرے میں دوڑ رہا ہے۔ دھند گہری ہو گئی ہے اور دیواریں، فرش، چھت، سب اس دھند میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ صبح سویرے اس نے اگر بتیوں کا پیکٹ لیا اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبر پر اگر بتیاں لگا کر جب اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اچانک ایک شبے نے سر سرا کر اس کے ہاتھوں کو ڈس لیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ تو اس کی ماں کی قبر نہیں ہے۔ اس کی ماں کی قبر تو ساتھ والی ہے جو اس طرح کچی ہے۔ یہ غلطی کس سے ہوئی، اس سے یا مستریوں سے یقیناً یہ مستریوں کی غلطی ہے وہ انہیں قبر دکھا کر چلا گیا تھا۔ انہوں نے غلطی سے ساتھ والی قبر پکی کر دی ..... اب کیا ہو ..... کیا ہو ؟

سارا دن ماں بوند بوند اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں اترتی رہی۔ دوسرے دن مستری ساتھ والی قبر پکی کر رہے تھے۔ شام کو اس نے غور سے قبر کا جائزہ لیا ...... ہاں یہ اس کی ماں ہی کی قبر ہے۔ اگلی صبح اگر بتیاں جلا کر جب وہ دعا مانگ کر واپس مڑنے لگا۔ تو شک رینگ رینگ کر پھر اس کے ذہن میں اتر آیا۔ یہ قبر بھی اس کی ماں کی نہیں اس نے غور سے دونوں پکی قبروں کو دیکھا۔ دونوں میں کوئی بھی اس کی ماں کی قبر نہیں ہے وہ تو ان سے اگلی قبر ہے۔ شک اور یقین کی اس دھند میں تیسری، چوتھی اور پھر پانچویں اور چھٹی قبر بھی پکی ہو گئی۔ لیکن اسے یہی شبہ رہا کہ ان میں سے کوئی بھی قبر اس کی ماں کی نہیں۔

اب ہر رات وہ خواب دیکھتا کہ قبر کی چھت بیٹھ رہی ہے۔ پانی بوند بوند رس رہا ہے اور ماں سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر رہی ہے۔ تصویر کے منظر میں اداس میلے کبوتر اڑ رہے ہیں۔ ان کی اڑان میں شکست اور تھکاوٹ ہے۔ چہرے بلک رہے ہیں اور خوف جسموں پر دستک دے رہا ہے۔ جسم بکھر رہے ہیں ریزہ ریزہ —— ریزہ ریزہ

اس نے وہ ساری قطار پکی کروا دی۔ لیکن اب اسے یہ شبہ ہوا کہ اس کی ماں کی قبر اس قطار میں ہے ہی نہیں وہ تو اگلی قطار میں ہے اب دوسری قطاروں کی قبروں کے پکے ہونے کا کام شروع ہوا۔ ہر روز ایک قبر پکی ہوتی اگلی صبح اگر بتیاں جلا کر دعا مانگتے اسے خیال آتا کہ یہ اس کی ماں کی قبر نہیں ہے۔ وہ اس سے اگلی قبر پکا کرنے کا کام شروع کروا مطمئن ہو کر گھر جاتا۔ خواب میں تصویر کی غم آلود مسکراہٹ والی عورت، اداس سوچ میں ذہن رکھا منظر اپنی پر نہیں کھولتا۔ اس کے ہونٹ ہلتے مگر آواز سنائی نہ دیتی۔ بھوک سے بلکتی وادی میں ٹھٹھرتے چہرے، اداس غم آلود مسکراہٹ، بوند بوند رستا پانی —— سوالیہ نشان —— سوالیہ نشان —— ادھورے الجھے ہوئے نشان - دوسری کے بعد تیسری اور چوتھی قطار کی قبریں پکی ہو گئیں۔

لیکن اس کی ماں کی قبر اسی طرح کچی رہی۔ رات کو خواب میں تصویر کی غم آلود مسکراہٹ۔ قبر کی بیٹھی چھت، بوند بوند رستا پانی اور سردی سے ٹھٹھرتی ماں، دھندلاتے اداس خالی منظر میں گم ہو جاتے جس دن قبرستان کی آخری قبر بھی پکی ہو گئی۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور ساری پکی قبروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا ..." ان میں سے کوئی ایک قبر میری ماں کی بھی ہے مجھے معلوم نہیں مگر وہ پکی تو ہو گئی ہے نا ——"

اگلی صبح سورج ابھی مشرق کی چلمن سے جھانکنے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اس نے بیوی اور بچوں کو جگایا اور کہا کہ وہ سب اس کے ساتھ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے چلیں۔ قبرستان پہنچ کر اس نے بیوی بچوں سے کہا کہ وہ سب قبروں پر اگربتیاں اور پھول لگا دیں ۔ اس کی بیوی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا —— "بھئی یہ سب میری ماں کے پڑوسی ہیں ..." اور دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ سے کہا ....." سچی بات ہے مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان میں سے میری ماں کی قبر ہے کونسی ..."

قبروں پر اگربتیاں لگیں تو سارا قبرستان خوشبو سے مہک اٹھا۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے دعا مانگ کر سب نے ہاتھ نیچے گرا لئے لیکن اس کے ہاتھ خلا میں ہی پتھر ہو گئے۔ اسے یاد آیا۔ یہ تو وہ قبرستان ہی نہیں جس میں اس نے اپنی ماں کو دفن کیا تھا تو اس کی قبر ابھی تک کچی ہے ... تصویر میں ایک عورت غم میں گندھی مسکراہٹ کے ساتھ خالی منظر کو دیکھ رہی ہے —— قبر کی چھت دھیرے دھیرے بیٹھ رہی ہے۔ پانی بوند بوند رس رہا ہے اور ماں دیوار سے لگی ٹھٹھر رہی ہے۔ جھکے ڈھلے شانوں کے ساتھ سب سے پیچھے آتے ہوئے اس نے آپ سے کہا ..." میں دوسرے قبرستان کی ایک ایک قبر پکی کروا دوں گا۔"

اسے خیال آیا اس شہر میں تو کئی قبرستان ہیں "کوئی بات نہیں" .... وہ بڑبڑایا ..." میں اس شہر کے سارے قبرستانوں کی ایک ایک قبر پکی کرا دوں گا۔" اطمینان کے پرندے نے ایک لمحہ کے لئے رنگ برنگے پر پھڑپھڑائے اور دوسرے لمحے خالی منظر میں گم ہو گیا ... اسے خیال آیا ——

"کیا معلوم یہ وہ شہر ہی نہ ہو جہاں اس کی ماں دفن ہے۔"